خدا بخش لائبریری جرنل

شمارہ : ۱۸۷ — ۱۹۰ جنوری — دسمبر ۲۰۱۷

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ایڈیٹر
ڈاکٹر شائستہ بیدار
ڈائریکٹر، خدابخش لائبریری

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۸۷-۱۹۰

زرسالانہ

افراد	:	۴۰۰/-
ادارہ	:	۵۰۰/-
غیر ممالک		
افراد	:	۳۰ ڈالر
ادارہ	:	۶۰ ڈالر

مقالہ نگاروں کے افکار و آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

محمد جاوید اشرف نے پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	پانچ-چھ
رشید احمد صدیقی کے غیر مطبوعہ خطوط (پیشکش: ڈاکٹر فرد الحسن)	۱
پروفیسر سید حسن عسکری۔ ایک عظیم مورخ اور ہر دل عزیز شخصیت، از پروفیسر محمد انوار الحق تبسم	۱۹
اقبال اور تصوف، از ڈاکٹر منظر اعجاز	۳۵
وارث علوی: رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں رہا، از ڈاکٹر غلام شبیر رانا	۵۱
دیا نرائن نگم کا اقبالؔ (ش)	۶۳
سرسید کا اخبار سینٹفک سوسئٹی/علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، (ش)	۱۴۵
ارتباط تمثیل بہ سبک ہندی: صائب و بیدل، از دکتر اخلاق احمد آہن	۲۰۵
تازہ کتب و رسائل: تعارف	۲۲۲

انگریزی۔ ہندی

رسول عربیؐ، از مرحوم پروفیسر محمد حبیب (انگریزی)	۱
جات پات اور ہندوستانی سماج، از ڈاکٹر رام نراین سنگھ (ہندی)	۱۴

مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، سنٹر آف پرشین اینڈ سنٹرل ایشین اسٹڈیز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

☆ ڈاکٹر رام نرائن سنگھ، شعبۂ سماجیات، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

☆ ڈاکٹر غلام شبیر رانا، مصطفیٰ آباد، جھنگ سٹی، پاکستان۔

☆ ڈاکٹر فرد الحسن، فیلو خدا بخش لائبریری (سابق)، ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ

☆ ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، پروفیسر آف ہسٹری (سابق) پٹنہ یونیورسٹی۔

☆ ڈاکٹر محمد حبیب، مرحوم پروفیسر شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

☆ ڈاکٹر منظر اعجاز، سابق صدر شعبۂ اردو، پاٹلی پترا یونیورسٹی، پٹنہ

اداریہ

خدابخش لائبریری ۲۰۱۴ء یا اس سے کچھ قبل ہی سے کچھ ایسے ناگزیر حالات سے گذری جس سے اپریل ۲۰۱۹ء سے پہلے نکل نہ پائی۔ لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں ۱۹۷۷ء سے نکلنا شروع ہوا، ۲۰۱۴ء میں پچھلی سیریز کا گویا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا، اس کے بعد ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء کے دوران جو تعطل رہا، ایک سال کے ایک شمارے کے حساب سے تو ہو ہی جاتا؛ سو اب ہو گیا، اور ۲۰۱۴ء کی طرح ان چار برسوں کا بھی بھرت پورا ہو گیا، یعنی ایک سال کے ایک شمارہ ہی کا حساب بن پایا، مگر تسلسل رکھنے کے لئے نمبروں کو مسلسل کر دیا گیا، آگے پھر یہ ہوا کہ ۲۰۱۹ء میں سال میں ایک شمارے کی اوسط بڑھا کے سال میں دو شماروں تک لے آیا گیا ہے، یعنی جنوری تا جون ۲۰۱۹ء-اور- جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۲۰۱۵ تا ۲۰۱۹ء کے 'مقروض' شماروں میں بیشتر تو نئی تحریریں ہیں، مگر ایک آدھ وہ

بھی جو ہماری قدیم میراث میں شامل تھیں، اوران کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں ازسرِ نو شائع کیا جائے۔

ان برسوں کے قرضے کی ادائی میں ہمیں عبدالرحمٰن صاحب (ساکن ضلع ارریہ سابق ضلع پورنیہ) کا تعاون حاصل رہا، اس کے لئے دلی شکریہ۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب نے سال ۲۰۱۹ء میں اس سیکشن کا چارج سنبھالا، ان سے بھی تعاون ملا۔ چند مضامین کا پروف بھی اچھے طور سے پڑھا، اور مجموعی ہیئت کو سنوارنے میں بھی (فہرست وغیرہ) انھوں نے مدد دی، اس کے لئے ان کا شکریہ۔ سب سے اہم شکرگزاری پرانے خریداروں کی ہم پر واجب ہے، اور نئے خریداروں کی شکرگزاری بھی۔ مزید شکرگزاری ان رسائل کی بھی جو خدابخش لائبریری کے ذخیرے کو بھرپور بنانے کے لئے اپنے مجلّات بھیجتے رہے ہیں۔ ان رسائل میں جو لائبریری کو موصول ہوتے رہے ہیں، اکثر کو ہم نے اپنی مستقل مبادلہ فہرست میں رکھا ہے، مبادلے والے رسائل کے مدیران کرام پر ہمارے جرنل کی رسید واجب ہے جب یہ تازہ شمارے ان تک پہنچ جائیں۔

ہمارا جرنل ان مضمون نگاروں کو پہنچنا ضروری ہے، اور متوقع مضمون نگاروں کو بھی، جو خدابخش لائبریری اور اس کے جرنل سے تعلق بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

(ش)

پیشکش: ڈاکٹر فرد الحسن

رشید احمد صدیقی کے خطوط

بنام ڈاکٹر محمد حسن

۲۷/ اپریل ۵۵ء

مکرمی تسلیم! گرامی نامہ مورخہ ۱۶/ اپریل۔ مطبوعات کے سلسلہ میں شعبہ کو جو پانچ سو روپے ملے ہیں، وہ دو کتابوں کے لئے تھے، ایک آپ کی دوسری ڈاکٹر سراج الحق قریشی کی، ظاہر ہے دونوں کے لئے یہ رقم ناکافی ہے، اب یہ بتایئے کہ آپ کی کتاب کتنی چھپے گی اور اس پر لاگت کیا آئے گی، میں چاہتا ہوں کہ پہلے تخمینہ تیار کرا کے آپ میرے پاس بھجوا دیں۔ اس کے بعد میں دیکھ لوں گا۔

آپ کی تجویز بہت مناسب ہے کہ آپ اسی تعطیل میں اپنی نگرانی میں اپنی کتاب ''اردو ادب میں رومانوی تحریک''، لکھنؤ میں طبع کرالیں، آپ تخمینہ بھجوا دیں بقیہ مراحل میں طے کرلوں گا۔ شعر سنتے سنتے آپ کا انفلوائنزا میں مبتلا ہو جانا اتنا تعجب انگیز نہیں ہے، جتنا اسی سلسلے میں میرا بھلنساہت سے ہاتھ دھو لینا۔ میں غیر معمولی حد تک صابر اور شاکر رہتا ہوں، لیکن معلوم نہیں کیا بات ہے ادھر شاعر نے بغیر کسی سخت اصرار کے اپنا کلام سنانا شروع کیا، ادھر میری کمینہ خصلتیں بیدار ہونی شروع ہوئیں۔ مکان کے بارہ میں سرور صاحب کا کمینوں سے سابقہ ہے، آپ کا سرور صاحب کی غزلوں سے اللہ دونوں پر رحم فرمائے، توفیق ہوئی تو دوا دوش بھی کر لیں گے۔ احتشام صاحب کی خدمت میں میرا سلام شوق پہنچایئے۔

آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۲/ مئی ۵۵ء

محمد حسن صاحب، تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۳۰/ اپریل۔ دانش محل نے جو تخمینہ دیا ہے، اسے اپنی ایک تحریر کے ساتھ کل ٹریژرر صاحب کی خدمات میں بھیجوں گا، جس میں درخواست یہ کروں گا کہ آپ کو نصف رقم پیشگی دے دی جائے اور بقیہ رقم بعد تیاری کتاب دے دی جائے، بات کچھ اس طرح ہوگی کہ سارے مراحل

خیر وخوبی سے طے پا جائیں گے۔ سرور صاحب کے دو خط آئے ایک پہلے دوسرا آج۔ ایک خط کا جواب ابھی دے رہا ہوں۔ احتشام صاحب کی خدمت میں آداب، آپ کے مکان کے بارہ میں بھی کل ٹریژرر صاحب سے گفتگو ہوگی، دیکھنا یہ ہے کہ صورت حال کیا ہے۔ آپ کا، رشید صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۷/مئی ۵۵ء

محمد حسن صاحب، تسلیم! عنایت نامہ مورخہ ۲۵/مئی ابھی ابھی موصول ہوا، یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دفتر نے آپ کے پاس روپئے بھیج دیئے، گو مجھے اس کی اطلاع نہ دی گئی اور میں برابر کڑھتا رہا کہ آپ کیا کہتے ہوں گے۔ آپ کی فرمائش کے مطابق میں کتاب پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دوں گا، لیکن ابھی تو یہ مرحلہ خاصا دور ہے، وقت آنے پر دیکھا جائے گا، یوں ضرور آیئے لیکن مکان کے سلسلہ میں آنا کچھ زیادہ سودمند نہیں اس لئے کہ یہ مسئلہ تو یونیورسٹی کھلنے پہ طے پائے گا، موسم یہاں کا ان دنوں خلاف معمول بہت اچھا ہو گیا ہے۔ امید ہے آپ مسرور ومع الخیر ہوں گے۔ خیر طلب، رشید احمد صدیقی۔

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۳۰ جون ۵۵ء

محمد حسن صاحب مکرم تسلیم! گرامی نامہ مورخہ ۲۸/ جون کل شام ملا ہے، کتاب کی قیمت کے بارہ مین یہ عرض ہے کہ آپ احتشام صاحب اور چاہیے تو نسیم صاحب کو بھی شامل کر لیجئے، مناسب قیمت مقرر کر دیں، بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ ڈھائی روپیہ فی نسخہ نامناسب قیمت نہ ہوگی، ٹائٹل وغیرہ کی ڈیزائن بھی آپ ہی تینوں طے فرمالیں، البتہ سائز وہی ہونا چاہیے جو شعبہ کی مطبوعات کا ہے۔ یہاں کا موسم بہت اچھا ہے، احتشام صاحب نے آپ کو ایک خط میرے پتہ پر لکھا تھا، وہ کئی دن میرے پاس رکھا رہا، جب آپ کا پتہ نہ چلا تو پرسوں میں نے اسے پوسٹ کر دیا ہے، آپ کو ملا ہوگا، آپ کے لئے مکان کے بارہ میں قطب صاحب سے گفتگو آئی تھی، وہ خیال رکھیں گے، جو خبر آپ نے دی ہے وہ اپنی مصروفیات کے ساتھ ان تک پہنچاتا ہوں، دیکھیے کیا ہوتا ہے، احتشام صاحب اور سرور صاحب کی خدمت میں آداب۔ آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۶/ جون ۱۹۵۶ء

محمد حسن صاحب مکرم، سلام نیاز! نوازش نامہ مورخہ ۱۴ جون ابھی ابھی موصول ہوا، یاد

فرمائی کے لئے شکر گذار ہوں، مولانا ماجد صاحب سے آپ کی جو خط کتابت رہی اس سے بڑی تفریح ہوئی موصوف نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ کوئی نئی بات نہ تھی موصوف کا گفتگو فرمانے کا یہی انداز ہے۔ میں بھی اس پر داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس مقصد کے لئے آپ کی نظر انتخاب کس پر پڑی!

موصوف کے فرمودات کے ساتھ ساتھ میری بھی ایک بات یاد رکھئے گا کہ بد اعمال کی بخشائش تو ممکن ہے کبھی ہو جائے، بدنیت کبھی نہ بخشا جائے گا۔

مشرق اور مغرب کی تنقید پر آپ جو کچھ لکھنے والے ہیں، خدا کرے وہ پورا بھی ہو جائے۔ مجھے یقین ہے وہ چیز اچھی ہوگی اور ہمارے طلبا اور ہم سب آپ کی اس پیش کش پہ آپ کے احسان مند ہوں گے۔ انشاءاللہ۔

حیدرآباد اور نینی تال کے موسم سے لطف اندوز ہونے کے بعد ان دنوں مرادآباد میں آپ پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ کون کر سکتا ہے، جو علی گڑھ کی مئی اور جون جھیل رہا ہے۔ سرور صاحب، مسعود صاحب، نسیم صاحب اور غالباً جذبی اور خلیل صاحبان مسرور مع الخیر ہوں گے۔

خیر طلب، رشید احمد صدیقی

☆

۹/ اکتوبر ۵۹ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ساغر نظامی صاحب کا کل ایک خط شام کی ڈاک سے ملا، جس میں انہوں نے مجھ سے انٹرویو لینے کی فرمائش کی تھی، آپ کے یہاں ان کا قیام ہونے والا ہے، اور سرور صاحب سے انٹرویو میں مدد لینا چاہتے ہیں۔

میں نے کل ہی جواب میں عرض کیا ہے کہ مجھے اس خدمت سے معذور سمجھا جائے، احتیاطاً اکسپریس ڈلیوری سے ایک اور خط بھیج دیا ہے اور سرور صاحب کو بھی مطلع کر دیا ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو خود بھی لکھدیں، یہ ساری احتیاط اور تردد اس لئے کہ ساغر صاحب کو صورت حال سے آگاہی رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تشریف لائیں تو مایوسی ہو۔

آپ کا رشید احمد صدیقی

☆

جامعہ اردو، علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب مکرم

عنایت نامہ موصول ہوا، کتابوں کے بارے میں دفتر سے رجوع کیا ہے۔ کمیٹی کے فیصلے کو

دیکھ کر مطلع کروں گا۔ جہاں تک حافظہ ساتھ دیتا ہے، جامعہ کے امتحانات کو پیش نظر رکھ کر اردو کی مختصر تاریخ لکھنے کا کام آپ کے؛ اور اصناف سخن سے متعلق غالباً ڈاکٹر قمر رئیس کے سپرد کیا گیا ہے۔ تاریخ کا کام تو آپ شروع ہی کر دیں۔ معاوضہ کی رقم طے کرنے کا فریضہ ڈاکٹر مسلم صاحب اور میرے سپرد کیا گیا ہے، شیخ نیازی کے ہندی ترجمے کی گاڑی آگے نہیں چلتی تو نہ سہی۔ ترجمہ تو میں یہاں کرا سکتا تھا البتہ جاننا یہ چاہتا تھا کہ ہندی کا کوئی اچھا اور مستند پبلشر اسے شائع کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں، نیز ہندی ترجمے کی نکاسی کیسی ہوگی۔ بہر حال آپ نے جتنا کیا بہت کیا بقیہ پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ ماڈریشن کے سلسلے میں آپ نے بہت زحمت اٹھائی جس کے لئے شکر گذار ہوں، بعض Setters کے بارے میں ڈاکٹر نذیر صاحب سے بھی بات کی تھی، وہ تو بعض کے ''اسم گرامی'' بھی بدلنا چاہتے تھے! بہر حال آئندہ تقرر میں لحاظ رکھا جائے گا، فکر و نظر ابھی معلق ہے باوجود نذیر صاحب کی غیر معمولی جد جہد کے۔ پچھلے جمعہ کو یہاں ۱۷/ گھنٹے میں ساڑھے گیارہ انچ بارش ہوگئی، آب کی کثرت دانے کی قلت اور corruption کورپشن کا یہ عالم بقول شخصے استغفر اللہ کی پناہ! آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۴/ جنوری ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر صاحب مکرم! ۱۳/ کا نوازش ملا ٹھیک ہے، وہ جذبی ہی والا مضمون رکھئے، مجھے اتفاق ہے، البتہ اسے نقل کرائیے گا، اس مضمون سے جو مضامین کے جدید ایڈیشن میں ہے جسے میں نے جہاں تہاں سے درست کر دیا ہے اور طباعت کی بہت سی غلطیاں ٹھیک کر دی ہیں، یہ ضروری ہے۔ آپ کی تصنیف ''دلّی میں اردو شعری.....'' نہ صرف میں نے پڑھ ڈالی بلکہ میرے Through سے (بقول ایک صاحب) خلیق نظامی اور اسلوب صاحبان نے بھی دیکھ لیا، اپنی تصنیف اور مضامین کے بارے میں آپ میری رائے پہلے سے فرض کر لیا کیجئے۔ میری ہی نہیں عزیز صاحب کی بھی جو میری طرح آپ کی تحریر کے ہمیشہ سے معترف ہیں۔ فاروقی صاحب کا خط آیا تھا کہ وہاں آ کر کوئی مقالہ پڑھوں اور سو روپے قبول کروں۔ جواب کچھ اس طرح کا لکھ دیا ہے دونوں میں سے صرف آخر کی شرط قبول ہے۔ دوسری فرمائش ذکاء اللہ پر مضمون لکھنے کی ہے، اس کی معذرت لکھ دی ہے۔ اب تک چیک نہیں آیا اس لئے دفتریوں کے لئے عذاب جان بنے رہیے، شاید مطلب برآری ہو جائے تو بڑا کام نکلے۔ امید ہے آپ سب مع الخیر ہوں گے۔ مقیت کے بارے میں آپ نے کچھ نہ بتایا۔ رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۳/فروری ٦٦ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! اپنے مقالے کے بارے میں آپ سے عرض کر آیا تھا کہ خواجہ صاحب سے بعنوان شائستہ فرمادیجئے گا کہ میرے وعدے کو حتمی نہ سمجھیں۔ احتیاطاً کل لکھ بھی دیا ہے کہ موصوف معذور سمجھ کر معاف فرمادیں، جی نہیں چاہتا کہ مخلص دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ میں بھی ویسا ہی سلوک کروں۔ اس دن آپ کو میری وجہ سے جو زحمت اور زیر باری ہوئی اس کے لئے نادم بھی ہوں اور مسرور و مفتخر بھی! آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

ذکاءاللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ، یکم اپریل ٦٦ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، آداب! ۲۹/ کا نوازش نامہ کل ملا، کئی دن ہوئے، ڈاکٹر ظہیر صدیقی سر رہ گذر مل گئے تھے ''کیا کہئے'' کے سلسلے میں معلوم ہوا کہ رجسٹری آپ کو مل گئی تھی اور متعلقہ کاغذات سب کو پہنچا دئے گئے۔ شکریہ۔ Viva کے سلسلہ میں دہلی گیا تھا تو خواجہ صاحب نے حسب معمول بڑے خلوص و اصرار سے انجمن اساتذہ اردو جامعات کی مجوزہ کانفرنس کے افتتاح کرنے کی دعوت دی، حسب معمول ہی میں نے فوری عواقب سے محفوظ رہنے کی خاطر اقرار و انکار کے بین بین کچھ باتیں کہہ دی تھیں، اب حسب معمول سوچتا ہوں کہ کیا کروں، حال میں اسی طرح کی تقریب اپنی یونیورسٹی میں بھی تو منعقد ہوئی تھی، دونوں میں فرق کیا ہے۔ مجوزہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد معلوم ہوسکیں تو لکھ بھجوایئے گا۔ سوچتا ہوں معلوم بھی ہوئے تو کیا کرلوں گا! غرض عجب تاشقند میں مبتلا ہوں۔

معلوم نہیں مقیت صاحب کا کیا رہا، اور بلگرامی کس عالم میں ہیں عید کی تہنیت قبول فرمایئے، گو یہ خط دیر سے ملے گا۔ عزیزوں اور دوستوں کو ماوجب۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۴/فروری ۱۹٦۷ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۱۳/ کا گرامی نامہ ابھی ابھی موصول ہوا، پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی، ہم کس سوسائٹی میں ہیں اور کس مسلک کے پیروکار، دوسرے کے نقطۂ نظر پر سنجیدگی سے غور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ منافق یا احمق ہوں، جو کہتا ہوں صرف تصنع یا منافقت ہے۔ بہرحال میرے اس تمام کہنے سے کچھ نہیں ہونے کا، ہوگا وہی جو مجھے نہایت درجہ ناپسند ہے۔ خیال تھا کہ شاید میری زندگی تک لوگ مجھے معاف رکھتے۔ اس کے بعد جو ہوتا رہتا مجھے تو اس

Torture سے نہ گذرنا پڑتا، لیکن اتنا بھی Concede نہیں کرنا چاہتے تو مجبوری ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ اگر اس سلسلے میں آئندہ کسی بدمزگی کا سامنا ہو تو مجھے موردالزام قرار نہ دیا جائے۔ بقیہ ۱۸/کو جب آپ تشریف لائیں گے۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، اتوار ۲۵/فروری ۱۹۶۷ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! ۲۳/کا نوازش نامہ کل شام موصول ہوا، آج اتوار ہے، یہ خط اسٹیشن پر پوسٹ ہوگا پھر بھی دیکھیے کب ملے۔ جامعہ میں اکاؤنٹ کی اسامی کے لئے جن صاحب کا نام آپ نے تجویز فرمایا ہے وہ مناسب ہے لیکن قانونی اور انتظامی امور میں ہم سب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی رائے کو بہت وقعت دیتے ہیں، جو ہمیشہ نہایت سنجیدہ اور صائب ہوتی ہے، آپ کا خط میں نے موصوف کی خدمت میں بھیج دیا ہے، اور اپنی طرف سے بھی مناسب کلمات لکھ دئے ہیں، علیم صاحب آپ کو بہت عزیز رکھتے ہیں، آج سے نہیں سالہا سال سے، کیوں نہ ایک خط آپ براہ راست لکھ دیں، سید بہاء الدین صاحب کو بھی ابھی نہ بھیجئے، ڈاکٹر صاحب کے جواب کا انتظار کر لیجئے۔ کانگریس کا الکشن میں جو حال ہوا ہے، اس پر فارسی کا ایک شعر یاد آتا ہے، حسب معمول پہلا مصرعہ ختم ہوتا ہے، کس چوں تو نبود'' پر اور دوسرا کس جوں تو مباد'' پر!

سب کو دعا، مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۲/فروری ۶۸ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ممکن ہے ڈاکٹر یوسف صاحب نے آپ سے ''نذر رشید'' کی تحریک کی ہو، موضوعات کے آج کے گرامی نامے سے ایسا ظاہر ہوتا ہے۔

یوسف صاحب نے غالباً مسعود صاحب کو بھی لکھا ہے۔ مسعود صاحب سے میں نے عرض کیا ہے کہ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ ایسا کیا جائے، اور التجا کی ہے کہ ایسا نہ کریں، مجھے اس سے بڑی تکلیف ہوگی، چنانچہ آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس تحریک کو ہرگز ہرگز آگے نہ بڑھائیں، میں اپنے عزیز ترین دوستوں سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ اس بارے میں میری التجا قبول فرمائیں گے، اور مجھے شدید ذہنی تکلیف میں مبتلا نہ کریں گے۔ اس وقت اتنا ہی عرض ہے۔ بعد میں مزید گفتگو ہوگی۔

آپ کا رشید احمد صدیقی۔

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، دوشنبہ ۳۱/ مارچ ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! آپ کے نام آج خط لکھ کر پوسٹ کر چکا تھا کہ ۲۹/ کا گرامی نامہ ملا، صورت حال معلوم ہوئی، خدا کرے ویسا ہی ہو جیسا کہ خیال ہے، اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔ حیدر آباد کے لئے مجھ سے اور مسعود صاحب سے آج سے بہت پہلے گفتگو ہو چکی تھی اور اکثر ہوا کی، بہر حال اللہ مالک ہے، وہ جو کرے گا بہتر ہی ہوگا، آپ مطمئن رہیں، بات صیغۂ راز میں رہے گی۔

آگرہ سے طلبی کی بڑی سخت یلغار ہوئی، کل شام تک یہ سلسلہ جاری رہا، اللہ کا شکر ہے کہ ڈگمگایا نہیں، اس سے تقویب ہوئی کہ شاید آئندہ بھی نہ ڈگمگاؤں۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۸/ اپریل، دوشنبہ ۶۹ء

ڈاکٹر صاحب، تسلیم! حیدر آباد کی خبر مجھے آپ کا نوازش نامہ ملنے سے ایک دن پہلے معلوم ہو چکی تھی، کیا کہئے! لیکن زندگی نے آپ کو مشکلات اور مایوسی میں کام کرتے رہنے یعنی اپنی بہترین صلاحیتوں کو برسر پیکار لانے اور رکھنے کا ایسا ملکہ عطا کیا ہے کہ آپ کو اس کا غم نہ ہوگا، اور کیا معلوم خدا متوقع ترقی کے امکان کو قوی کر چکا ہو۔ معلوم نہیں وہ اسکیم کس منزل میں ہے اور ہوا کا کیا رخ ہے، بیگم صاحبہ اور بچوں کو بہت بہت دعا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۴/ اگست/ ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم

۲۹/ جولائی کو یونیورسٹی میں ملاقات کا موقع ملا لیکن آپ سے گفتگو نہ ہو پائی، حالانکہ سفر کا ایک ضروری مقصد یہ بھی تھا، اس کی تلافی یوں ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر مسعود صاحب سے بھی ملاقات ہوتی ہے تو تھوڑی دیر تک ہر سیاق وسباق میں آپ کا ذکر خیر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز صاحب نے ایک کتاب لکھی ہے اردو کا سماجی پس منظر آپ کو بھی بھیجا ہوگا، مقدمہ میں آپ کی تصنیف کا ذکر کیا ہے، آنکھوں کی تکلیف سے اس قابل نہیں رہا کہ دیر تک اطمینان سے کچھ پڑھ سکوں۔

آج کل کچھ کام کر رہے ہیں؟ یہ اس لئے پوچھتا ہوں کہ آپ کا دلی بقول غالب عدو ہے

فراغ کا!

بیگم صاحب اور بچوں کو دعا!

کبھی ادھر نہ آیئے گا؟ ملفوفہ خط پروفیسر ضیاء احمد صاحب کی خدمت میں پہنچا دیجئے گا۔

معلوم نہیں رشید حسن خاں صاحب وطن سے واپس آئے یا نہیں، اور نظام لکچرز کی کتابت کس منزل میں ہے؟

رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ، ۴/ اکتوبر ۱۹۶۹ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۳۰/ کو دہلی میں میٹنگ میں شرکت کر کے واپس آ گیا، وہی قرار داد خصوصی رہی جو رہا کرتی ہے، فاروقی صاحب سے تادیر گفتگو رہی، آپ نے ۱۹/ کے گرامی نامے میں جو امور تحریر کیے تھے وہ سب معرض بحث میں آئے، فاروقی صاحب کے سامنے اردو کے ایڈوائز سنٹر کا قیام ہے، لیکن ہو تو کیوں کر ہو۔ اس کا کوئی بھی صحیح حل ان کے سامنے نہیں ہے، بالآخر میں نے اپنی گفتگو کو وکالت سے ہٹا کر اس درخواست پر ختم کیا آپ کو دہلی میں کسی نہ کسی طرح اردو کی پروفیسری ملنی چاہیے، ایڈوائسڈ اسٹڈی سنٹر قائم ہو یا نہیں، نیز یہ کہ آپ کا فاروقی صاحب پر حق تھا جس کو اب تک انہوں نے نہیں ادا کیا ہے۔ اطمینان نہیں ہے کہ مری باتوں کا موصوف پر اثر ہوا، اور جی کبھی نہیں چاہا کہ غالب کے ساتھ دعا مانگوں کہ: دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زبان اور، آپ مضطرب نہ ہوں، آپ جہاں کے تہاں زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے۔ بلکہ ایک سے ایک ممتاز درجوں پر فائز ہوں گے۔ محض دیر یا سویر کی بات ہے، انشاء اللہ۔ مطلوبہ چیک دہلی یونیورسٹی سے کل موصول ہو گیا شکریہ۔ متعلقین کو دعا۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، سنیچر ۳/ اکتوبر ۷۰ء

ڈاکٹر صاحب مکرم۔ تسلیم! ایک مدت سے نہ کوئی خط کتابت ہوئی نہ ادھر ادھر آپ کا پھیرا ہوا لیکن ادھر ادھر سے آپ کی خیر و عافیت معلوم ہوتی رہتی ہے یہی کہ آپ بے حد مصروف رہنے لگے ہیں، عصری ادب سے اس کی تصدیق ہوتی رہتی ہے، جو آپ کے کرم سے برابر ملتا رہتا ہے، کئی دن ہوئے ایک نمبر ملا۔ ان دنوں آنکھ کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ اس لئے لکھنے پڑھنے کا کام تقریباً بند ہے، یہ ایک مزید تکلیف ہے۔ جس میں مبتلا رہنے لگا ہوں۔ امید ہے بیگم صاحبہ اور بچے مع الخیر ہوں گے۔

میری دعا پہنچایئے گا۔ رشید حسن خاں صاحب سے دریافت فرمایئے گا۔ کہ نظام خطبات کس قیمت میں ملتے ہیں، اکثر فرمائش آتی رہتی ہے، میرے پاس کوئی نسخہ نہیں رہا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۵/نومبر ۷۰ء

ڈاکٹر صاحب مکرم! آپ کے پچھلے خط کا جواب دے چکا ہوں اب تک مل گیا ہوگا۔

اس وقت ایک ضرورت یہ آن پڑی ہے کہ کسی طرح میرے دئے ہوئے نظام لکچرز (غالب) کے پانچ نسخے بذریعہ ڈاک جلد سے جلد بھجوا دیجئے۔ دام مجھے معلوم نہیں ورنہ پیشگی بھیج دیتا۔ میں نے شاید آپ کو لکھا تھا کہ یہ خطبے کس قیمت پر مل جاتے ہیں، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں آیا، ایک عزیز کو ان کی بڑی ضرورت ہے جو سفر کے لئے پا بہ رکاب ہیں۔

رسم خط کے سیمینار کے لئے اپنا مضمون ہفتہ عشرہ کے اندر انشاء اللہ بھیج دوں گا۔ آپ ہی کے نام بھیجوں گا، آپ ملاحظہ فرما کر فاروقی صاحب کے حوالے کر دیں گے۔ بچوں اور بیگم صاحبہ کو دعا۔ مطلوبہ خطبات کا خیال رکھئے گا، دام کا مطلق لحاظ نہ کیجئے گا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی، علی گڑھ، جمعۃ الوداع، ۲۷/نومبر ۷۰ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، آداب! ۶/ کا گرامی نامہ ملا، اردو رسم خط کے مسئلہ پر میری تحریک اور خیالات کو آپ نے پسند فرمایا، اس سے جی خوش ہوا، اس لئے اور کہ آپ زر و دولت کا اسراف، کرتے ہیں یا نہیں، تعریف و توصیف میں الفاظ کا اسراف کبھی نہیں کرتے۔ نورانی صاحب نے وہ خطبات نہیں بھیجے تا حال۔ احسان کا بڑا اصرار تھا، وہ کراچی واپس چلے گئے، اس لئے خطبات کی جلدی نہیں رہی۔ دو چار ہفتے میں کبھی مل جائیں گے تو کوئی خرچہ نہ ہوگا۔ لیکن جلد مل جانے میں یہ فائدہ تھا کہ معلوم نہیں کب کوئی جانے والا مل جائے تو بھیج سکتا۔ اردو رسم خط والی تحریر کے سلسلے میں عرض کیا تھا کہ اگر اس کا سائیکلو اسٹائل کیا جائے تو زائد کاغذ کے دام میں ادا کروں، مجھے کچھ نسخے مل جائیں تا کہ دوستوں اور عزیزوں کو دے سکوں۔ ۱۵/ دسمبر تک علی گڑھ تشریف لانے کا اتفاق ہو سکے گا یا نہیں۔ لا سکتے تو اس خط کے بارے میں گفتگو کرتا جو آپ کی نظر سے گذر چکا ہے جب آپ یہاں آئے ہوئے تھے۔ میرے مضمون کا سائیکلو اسٹائل گر رشید حسن خاں صاحب کی نگرانی میں ہو سکتا تو بڑا اچھا ہوتا، وہ پروف بڑی احتیاط اور قابلیت سے پڑھتے ہیں، میرا سلام شوق پہنچا دیجئے گا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، اتوار، نومبر ۷۰ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، سلام شوق! معاصر آج ملا، نوازش نامہ کل ملا تھا، آپ نے جن اطلاع میں یاد فرمایا، اس سے جی خوش ہوا، سیمینار سے متعلق مضمون عشرہ میں انشاء اللہ تیار ہو جائے گا، کوشش کروں گا کہ ٹائپ ہو جائے تا کہ ایک کاپی بہت پہلے سے آپ کو مل جائے، ظاہر ہے ایک نسخہ فاروقی صاحب کے لئے بھی بھیجوں گا۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کے موجودہ رسم خط کے جو لوگ خلاف ہیں ان کی نیت بخیر نہیں ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سیمینار میں شرکت کرتا اور ان اصحاب سے ذاتی گفتگو کا موقع ملتا جو اردو کے رسم خط سے بیزار ہیں، لیکن یہ ممکن نہیں۔ اب سفر اور مذاکروں میں شریک ہونے نہ جی چاہتا ہے نہ سکت باقی ہے۔ سیمینار کی روئیداد کہیں نہ کہیں شایع ہوگی اس سے سارا حال معلوم ہو جائے گا۔

احباب کی خدمت میں سلام شوق، بیگم صاحب اور بچوں کو دعا۔

اپنا توسیعی لکچر اپنے ہی رسالے میں کیوں نہ شایع کیجئے۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹/ جنوری ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! میرے خطوط آپ کو برابر ملتے ہوں گے، تفصیلات ڈاکٹر فاروقی سے معلوم ہوئی ہوں گی، خدا کو منظور ہے تو ڈی لکس سے ۲۹/ کو حاضر ہو جاؤں گا اور ڈی لکس ہی سے سہ پہر میں واپسی، ڈاکٹر فاروقی کو مطلع کر دیا ہے کہ ڈی لکس کا ایک ٹکٹ خرید رکھیں گے جو واپسی کے لئے ہوگا۔

اس سے پہلے میں نے جو فرمائش کی تھی اس کے بارے میں کیا کیا؟

ڈاکٹر فاروقی سے یہ فرمائش کی ہے کہ ۹ کوئی شناسا مجھے ریلوے اسٹیشن پر مل جائے تا کہ آسانی سے یونیورسٹی پہنچ سکوں۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۱/ جنوری ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۱۸/ کا نوازش نامہ کل ملا، آپ نے جن الفاظ میں یاد کیا اس سے خوش اور شکر گذار ہوا، اس طرح کی شرافت اور محبت کی باتوں سے خدا بھی خوش ہوتا ہے، جس سے انشاء

اللہ ہم دونوں کا بھلا ہوگا۔ جیسا کہ پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں، خدا کو منظور ہے تو جمعہ ۲۹/ کو ڈی لکس سے افتتاح کے لئے حاضر ہو جاؤں گا، بس یہ چاہتا ہوں کہ کوئی جان پہچان کا آدمی اسٹیشن پر مل جائے تو مجھے سیمینار تک پہنچا دے، خواجہ صاحب غالباً اس کا انتظام فرما دیں گے۔ کیا خطبہ افتتاحیہ کا ٹیپ ریکارڈ کفایت سے دستیاب ہو سکے گا، ایسا ہو سکتا تو احسان کو بھیج دیتا، ممکن ہے خواجہ صاحب اس کا انتظام کر سکیں، مجھے خوشی ہے کہ آپ کو وہ خط یاد ہے جو کبھی آپ کو دکھایا تھا کیا کہئے کہ اس کا ردعمل جوں کا توں ہے۔ آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

۲۷/ جنوری ۷۱ء، ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! کل سے طبیعت خراب ہے، ڈاکٹر نے نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی ہے، اس لئے جمعہ ۲۹/ کی تقریبات میں شریک نہ ہو سکوں گا، فاروقی صاحب کو تار دے دیا ہے، احتیاطاً آپ کو بھی اطلاع دے رہا ہوں۔ مغیث صاحب نے قوام کی سوئیاں خرید لی ہوں تو کوئی حرج نہیں، کسی وقت مل جائیں گی، دام البتہ لکھ بھیجئے گا، ارادہ ملتوی کر دینے سے آپ جانتے ہوں گے مجھے بھی مایوسی ہوئی ہوگی، قلب کے دکھ اور دغدغہ کا کتنا معاملہ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

اللہ مالک ہے۔ خدا کرے سیمینار پورے طور پر کامیاب ہو۔

فاروقی صاحب سے خاص طور پر معذرت کر دیجئے گا۔ آپ کا، رشید احمد صدیقی

کیا حرج اگر کوئی خطبہ پڑھ دے۔ کیا بتاؤں دل اب بھی چاہتا ہے کہ کاش وہ ہو سکتا جو بدنظر نہ چاہے (دوسرے قلم سے لکھا گیا ہے)۔

☆

ذاکر باغ، ۲۳/ فروری ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۲۰/ کا نوازش نامہ ابھی موصول ہوا، تعجب ہے مغیث صاحب نے آپ سے یہ کہہ دیا کہ میں عصری ادب کے لئے مضمون لکھ رہا ہوں۔ ان کو غلط فہمی ہوئی۔

میں نے اپنی معذوری کے جو وجوہات بتائے تھے اس کو انہوں نے مضمون لکھنے کا جواز قرار دیا، مضمون وغیرہ اب مجھ سے لکھے نہیں جاتے۔ ابھی بھی جان یا آبرو پر کوئی آفت آنے والی ہوتی ہے تو جان پر کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا ہوں۔ اپنی معذوری پر شرمسار اور آپ کی معافی کا خواستگار ہوں۔ جامعہ

اردو سے آپ نے معاوضہ امتحان طلب فرمایا ہے۔اس کے بارے میں مطمئن رہئے۔جلد کوئی نہ کوئی سامان کر دیا جائے گا۔تعجب ہے ڈاکٹر مسعود صاحب نے کس بنا پر یہاں کے حالات ناسازگار بتائے، جس کے سبب آپ نے آنا ملتوی کر دیا، میری دانست میں تو یہ صورت حال نہیں ہے۔سب کو دعا۔

خیر اندیش، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۴/ جولائی، ۷۱ء شنبہ

ڈاکٹر صاحب مکرم، آداب! گرامی نامہ موصول ہوا، آج کم وبیش سوا مہینے سے بیمار ہوں، قریب قریب صاحب فراش، زیادہ دور تک چل بھی نہیں سکتا، چہ جائیکہ سفر کی ہمت کر سکوں۔اللہ تعالیٰ آپ کے مراتب میں اضافہ فرمائے، ضمناً میری صحت میں بھی۔سب کو دعا۔آپ کا، رشید احمد صدیقی۔

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۷/ستمبر ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! کل ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی سے یہ مژدہ ملا کہ آپ کشمیر یونیورسٹی میں اردو کی پروفیسر شپ پر فائز ہو گئے، الحمدللہ۔آپ کو بیگم صاحبہ کو اور دوسرے عزیزوں اور دوستوں کو مبارکباد ہو۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۲/اکتوبر ۷۱ء

عزیز محترم، سلام شوق! نوازش نامہ ۹/کو مل گیا تھا، آپ نے جن الفاظ میں یاد فرمایا ہے اس سے بہت متاثر ہوا۔جواب میں کیا کہوں سوا اس کے کہ دعا کروں کہ آپ خوش اور نیک نام رہیں۔ یہ نعمتیں آپ کو پہلے سے میسر ہیں، اپنی قوت بازو اور شرافت سے۔اس میں میری دعا کو دخل نہیں، اللہ تعالیٰ ان میں برکت اور ثبات دے۔اس ۱۷/کو سرسید ڈے کے موقع پر مجھے خطبہ دینا ہے، کچھ اس طرح نرغے میں آیا کہ ذمہ داری قبول کرنی پڑی، ابھی پورا لکھ نہیں پایا جو کچھ لکھتا ہوں خوش نویس کو دے دیتا ہوں کہ جلی قلم سے لکھ دے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔طبیعت اچھی نہیں، اس پر یہ پریشر دیکھئے کیا۔چاہتا تو تھا کہ مسودہ آپ تک پہنچ جاتا، اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔۱۷/کو شرکت کے لئے تشریف لا سکئے گا؟ وقت دس بجے دن کا رکھا گیا ہے۔شب برات میں متعلقین کو چھوڑنا اچھا نہیں معلوم ہوتا ورنہ ایک دن پہلے آ سکتے تھے۔اور باتیں زبانی ہی ہو سکتی ہیں، لیکن وہ ایسی کچھ ضروری نہیں،

سب کو دعا، بیگم صاحبہ کو بچوں کو اور آپ کو۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۱۶/ اکتوبر ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! نامہ گرامی ملا تھا، آپ نے جن الفاظ میں خطبہ کی تعریف کی اس سے جی بہت خوش ہوا، اس سے زیادہ آپ کو خدا خوش کرے اور رکھے۔ کیا آپ کو فکر و نظر کا کوئی Reprint نہیں ملا ہے،۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب مرحوم پر ایک مضمون رسالے کی حالیہ اشاعت میں شایع ہوا ہے، ان دنوں خواجہ صاحب علی گڑھ آئے ہوئے ہیں، کل پروفیسر نظامی صاحب کے ہاں ملاقات ہوئی، آپ کے پروفیسر ہونے کا بھی ذکر آیا، کہتے تھے کوشش میں ہیں کہ آپ دہلی سے باہر نہ جائیں اور آپ کا موجودہ گریڈ اونچا کر کے پروفیسر شپ میں تبدیل کر دیا جائے، وائس چانسلر صاحب کے یہاں سفارش گئی ہوئی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دن اچھے آتے ہیں تو اچھے ہی آتے چلے جاتے ہیں، یوں ہونا مناسب ہے۔ کشمیر کی رہن سہن دہلی کی سی ہی ہوگی، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ دہلی علمی سرگرمیوں کے لئے بہتر جولان گاہ ہے۔ بالخصوص اردو کے لئے، سب کو دعا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۳/ اکتوبر ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۲۱/ کا عنایت نامہ کل صادر ہوا تھا، بہت بہت شکریہ یہ معلوم کر کے البتہ تشویش ہوئی کہ یہاں سے جانے کے بعد خواجہ صاحب کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ ایسا تو نہیں کہ یہ تکلیف اس پھوڑے سے متعلق ہو جو یہاں ٹوٹ گیا تھا اور مندمل ہو رہا تھا، اللہ تعالیٰ فضل فرمائے۔ آمین۔

رشید حسن خاں صاحب نے کچھ دن ہوئے اپنی ایک تالیف دردؔ اور ان کے کلام پر بھیجی تھی، اس کی رسید اور شکریہ کا خط میں نے ان کے مکان جبلی ہال کے پتے سے بھیج دیا تھا، معلوم نہیں ملا یا نہیں، ممکن ہے انہوں نے پتہ بدل دیا ہو اور خط تلف ہو گیا ہو۔ کل ان کی ایک دوسری تالیف شرر کے لکھنؤ پر موصول ہوئی تو خیال آیا کہ درد پر بھی کتاب بھیجی تھی وغیرہ۔ کہیں مل جائیں تو منسلکہ ورق ان تک پہنچا دیجئے گا، ورنہ خیال فرمائیں گے کہ تحائف کا شکریہ ادا کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ خدا کرے آپ سب مع الخیر ہوں۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، شنبہ ۷/نومبر ۷۱ء

محبی تسلیم! نوازش نامہ اوائل اکتوبر میں ملا، تھا جب آپ توسیعی لکچرز کے سلسلے میں عازم کشمیر تھے، سرسید ڈے والی تقریر ضرور بھیجتا، لیکن آخر وقت تک نام تمام رہی، بارے وہ وقت خیریت سے گذر گیا۔ باتیں حاضرین کو پسند آئیں، پروفیسر نظامی اس تقریب کے مہتمم خاص تھے، کچھ اضافے کے بعد مسودہ موصوف کو دے دیا، دیکھیے کب تک چھپے، شائع ہونے پر ایک نسخہ آپ کی خدمت میں ضرور بھیجوں گا، انشاءاللہ، آپ کے ہاں اردو رسم خط پر سیمینار ہو رہا ہے، خواجہ صاحب کا دعوت نامہ اور متعلقہ کاغذات ملے تھے، لیکن شرکت سے مجبور تھا، اس لئے معذرت لکھ کر بھیج دی تھی، اب خیال آیا کہ کچھ بھیج دوں۔ شاید کام چل جائے، خواجہ صاحب سے دریافت کیا ہے مسودہ کب تک بھیج دوں وغیرہ۔ آپ کا توسیعی لکچر کشمیر میں کیسا رہا۔ کہاں اور کب شائع ہوگا۔

بیگم صاحب اور متعلقین کو دعا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۷/فروری ۷۲ء

ڈاکٹر محترم، سلام شوق! سب سے پہلے نوازش نامے سے ہی ۲۴ کو خوش خبری مل گئی تھی لیکن احتیاط کے خیال سے اس کا ذکر گھر والوں سے بھی نہیں کیا، چاہتا تھا کہ تصدیق ہو جائے تو سب سے پہلے آپ کی محبت کا شکریہ ادا کروں۔ رات ریڈیو سے اس کی تصدیق ہوگئی۔ انعام پانے کی خوشی اپنی جگہ رہی لیکن اس سے بھی کچھ کم متاثر نہیں ہوں کہ آپ کو میرا اتنا خیال رہا۔ سوچتا ہوں کہ جب سے ہم دونوں کا ایک دوسرے سے ساتھ ہوا آپ کی خدمات (احسانات) تعداد، مقدار اور قدر و قیمت میں میری ان چھوٹی موٹی باتوں سے کہیں زیادہ ہیں جو آپ کے لئے میں نے کبھی کبھار کی ہوں گی۔ آپ کی شرافت، قابلیت اور دیرینہ وضعداری کا مجھے جو احساس ہے میرا خیال ہے وہ آپ کے لئے آپ کے کسی دوست عزیز اور بزرگ سے کم نہیں ہے، ان نظام خطبات کو شہرت دینے اور کامیاب بنانے میں آپ کا گراں قدر حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش نیک نام اور اقبال مند رکھے، آمین۔ بیگم صاحبہ اور بچوں کو بہت بہت دعاء۔ خدا حافظ، مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ،،۳/اپریل۷۲ء

ڈاکٹر صاحب محترم، آداب! گرامی نامہ ۲۷/ مارچ کو موصول ہوا تھا، دفتر سے معلوم ہوا کہ سرسید بک ڈپو کی مطبوعات کی فہرست آپ کی خدمت میں بھیجی جا چکی ہے۔ امید ہے کہ پہنچی ہوگی۔ طبیعت کی مسلسل ناسازی نے مجبور کیا کہ کچھ دنوں کے لئے اپنے فرائض نائب شیخ الجامعہ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد طاہر رضوی کے سپرد کردوں، اس لئے ان دنوں سارے کام سید صاحب کے سپرد ہیں، ہم سب کو بڑی تقویت اور خوشی ہے، کہ اب جامعہ کا کام آپ کی نگرانی میں بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتا رہے گا۔ تفصیل خط کی طاہر صاحب سے معلوم ہوگی۔ امید ہے آپ زیادہ سے زیادہ کاموں میں مصروف ہوں گے، اور اتنے ہی زیادہ اپنے سے خوش ہوں گے۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۴/ جون۷۲ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! ۲۱/ کا عنایت نامہ کل شام موصول ہوا، صحت کی خرابی کے باعث جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کے منصب سے مستعفی ہوگیا ہوں۔ پروفیسر ڈاکٹر سید محمد طاہر رضوی نائب شیخ الجامعہ میری جگہ کام کر رہے ہیں، جامعہ اردو سے متعلق جو باتیں آپ نے تحریر فرمائی ہیں وہ بجنسہ طاہر صاحب کے پاس بھیج دی گئی ہیں، وہ مناسب کاروائی کریں گے، آپ نے میری تحریر (خطبہ کے اقتباسات) کے بارے میں جو توصیفی تحریر خط..... (دو لفظ پڑھے نہ جا سکے) اس کے لئے شکر گذار ہوں، خبر نامہ ملا تھا، خوب ہے اس سلسلہ میں ایک شعر یاد آیا۔

منعم بدشت وکوہ وبیاباں غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

اشتراکیت اور اشتراکی ادب سے متعلق ہم دونوں جو اختلاف ساتھ رکھتے ہیں، وہ فروعی نہیں اصولی ہیں اور اس بارۂ خاص میں ہم دونوں ایک دوسرے کو معذور قرار دے کر معاف کر سکتے ہیں، شریفوں کا یہی شیوہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس شیوہ کو ہم آپ دوسروں سے زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۸/ مارچ ۱۹۷۲ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! امید ہے کہ آپ بخیریت تمام ''کام پر پہنچ گئے ہوں گے'' (مزدور محنتیوں کی مروجہ اصطلاح میں) اور اپنے پرائے سب کے فرائض کی بجا آوری میں مصروف و منہمک ہوں گے۔

میں نے سرسید بکڈ پو (جامعہ اردو) کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ اپنے مطبوعات کی فہرست آپ کی خدمت میں بھیج دیں، کیا آپ کی توجہ سے اس کی بعض کتابیں آپ کے ادارے یا اداروں میں داخل نصاب ہوسکتی ہیں؟

اگر ایسا ہوجائے تو بکڈ پو کو بڑا نفع پہنچے گا۔ ایک زمانہ میں کشمیر میں شاید یہ قاعدہ بنا دیا گیا تھا کہ وہاں باہر کی اردو مطبوعات داخل نصاب نہ ہوسکتی تھیں۔ جامعہ اردو کے کچھ انتظامی امور جو کشمیر میں امتحانات جامعہ سے متعلق ہیں، میں آپ کے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ تفصیل سے بعد میں مطلع کروں گا۔

آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، منگل، ۲۳/نومبر ۷۲ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! کئی دن ہوئے گرامی نامہ صادر ہوا تھا، آپ کا شکریہ اور متعلقین کو دعا کہ آپ نے اتنے اچھے لفظوں میں یاد فرمایا۔ آپ نے غالب اور مصطفیٰ خاں کا جو ذکر کیا اس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہوسکا کہ پردہ عدم سے وجود میں غالب اپنے ساتھ مصطفیٰ خاں کو لائے ہیں یا مصطفیٰ خاں غالب کو۔ بعد ہی میری آپ کی صحیح پوزیشن طے پا سکتی ہے۔

مجھے اس کی خوشی ہوتی ہے جب سنتا ہوں کہ آپ کے ذمے کوئی اور کام سپرد ہوا۔ یہ عمر اور موقع ایک سے ایک اچھے کام کرنے کا ہے، اور یہ کام کرنے کا انعام بھی ہے، اچھا تو ہے کہ آپ کو کشمیر میں جاڑے گذارنے پڑیں۔ اب تک میدان میں آپ گرم چشیدہ تھے، اب سرد چشیدہ ہوکر ''بے زنہار'' بن جائیں گے خدا آپ کی مدد فرمائے۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۸/نومبر ۷۲ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! کل مہر الٰہی صاحب آئے اور آپ کا مضمون ''اردو ۷۲ء'' پڑھنے کے لئے دیا جو سنڈے ورلڈ، مورخہ ۲۹/ اکتوبر میں شائع ہوا ہے۔ آج عید ہے مذکورہ مضمون اور عید دونوں کی مبارک باد دیتا ہوں۔ لب ولہجہ انگریزی، معنی ومطلب ہر اعتبار سے عالمانہ ہے، جیسا آپ کے انگریزی اور اردو دونوں کے کہنے کا خاص امتیاز ہے۔ شیرازہ وغیرہ میں آپ کے مضامین اکثر پڑھنے کو مل جاتے ہیں، اور خوب ہوتے ہیں، کیا موسم سرما کشمیر میں ہی بسر کیجئے گا؟

متعلقین کو دعا۔

مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، بدھ،۱۱/ اپریل۷۳ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، آداب! نادم ہوں اور اس سے فرار نہیں کہ آپ اس دن ملنے آئے اور میں مل نہ سکا، اور آزار کے عالوہ ادھر۲ ماہ سے ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف میں مبتلا ہوں، چلنا پھرنا درکنار اٹھنا بیٹھنا دشوار ہوگیا ہے، ڈاکٹر بتاتے ہیں ایک طرح کی Growth نمودار ہوگئی ہے جو اعصاب کو Paus کرتی ہے، علاج یہ ہے کہ تخت پر لیٹے رہو، وغیرہ۔

آپ جس دن تشریف لائے اس دن بڑی تکلیف تھی، آپ سے بدگمانی کا بھی اندیشہ نہ رہا، اس لئے بے تکلف عذر کہلا بھیجا، امید ہے آپ نے کچھ خیال نہ کیا ہوگا، اب کچھ افاقہ ہے لیکن نہ ایسا کہ اس پر یا اپنے پر بھروسہ کرسکوں، متعلقین کو دعا! خیر اندیش، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۹/ اپریل۷۳ء

ڈاکٹر صاحب مکرم تسلیم! معلوم نہیں معذرت کا خط آپ کو لکھ سکا ہوں یا نہیں جب کچھ دن قبل آپ ملنے تشریف لائے تھے اور اس دن غیر معمولی تکالیف میں مبتلا رہنے کے سبب سے میں نے معذرت کہلا بھیجی تھی، اس کا مجھے برابر خیال رہا اور آج بھی ہے، کیا بتاؤں کیسی تکالیف کے باعث کیسے کیسے دوستوں اور عزیزوں سے ندامت ہوتی رہتی ہے، مجھے امید ہے آپ معاف کر چکے ہوں گے اور تعجب نہیں کہ آپ آزردہ خاطر بھی نہ ہوئے ہوں۔ آپ کے بارے مین میرا مسلسل اور طویل تجربہ یہی رہا ہے۔ خدا آپ کو فائز ابرام رکھے۔ آمین، متعلقین کو بہت بہت دعا۔ مخلص، رشدی احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۷/ جون۷۵ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! ۱۵/مئی کا عنایت نامہ ملا، شکریہ، آپ نے جن الفاظ میں مسودہ کو سراہا ہے۔ اس سے بہت خوش ہوا۔ خدا آپ کو خوش وخرم رکھے۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مسودہ بحفاظت تمام واپس فرما دیجئے۔ اس کی بڑی ضرورت ہے اور واپسی کا برابر منتظر ہوں۔ بچوں کو دعاء۔

آپ کا، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۶/ مارچ ۷۶ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! تہنیت کا تار موصول ہوا، اخلاص واکرام کا شکر گذار ہوں، آپ نے کتنا یاد رکھا اور کس طرح یاد فرمایا! وہ شب و روز یاد آ گئے جب شعبہ جنرل ایجوکیشن میں آپ کی رفاقت نصیب تھی۔ شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا مانگتا ہوں کہ خدا آپ کو نیک نام اور خوش وخرم رکھے، آمین۔ جس کاغذ پر آپ کا گھر کا پتہ درج تھا وہ ادھر ادھر ہو گیا۔ یاد بھی نہیں رہا۔ اس لئے یونیورسٹی کے پتے پر بھیجتا ہوں، خدا کرے مل جائے۔ آج کل تصنیف وتالیف کی کن وادیوں میں ہیں؟۔

متعلقین کو دعا پہنچایئے۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۵/ جون ۷۶ء

ڈاکٹر صاحب مکرم، تسلیم! نادم ہوں کہ آپ کے غالب ایوارڈ پانے پر اب تک تہنیت نہ بھیج سکا۔ طبیعت ان دنوں زیادہ خراب رہی، اب بھی ہے لیکن یہ کوئی حادثہ نہیں ہے، اس کے علاوہ کچھ ایسی باتیں بھی پیش آتی رہیں جن کے ہوتے ہوتے نہ لکھنا تو یاد آتا رہا لکھنے کی سکت نہ پائی۔ بہر حال یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے آپ اس ایوارڈ اور امتیاز کی دلی تہنیت قبول فرمائیں اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کی شادمانی میں مجھے شریک سمجھیں، امید ہے مزاج عالی مع الخیر ہوگا۔ مخلص، رشید احمد صدیقی

☆☆☆

پروفیسر محمد انوار الحق تبسم

پروفیسر سید حسن عسکری

ایک عظیم مورخ اور ہر دل عزیز شخصیت

بہار کی مردم خیز سرزمین نے جہاں مختلف مذاہب کے رہنمائوں، مفکروں، صوفیوں اور سنتوں کو جنم دیا ہے، وہیں مختلف علوم و فنون اور سائنس کے ایسے قدآور سائنسدانوں، عالموں، مفکروں، مورخوں محققوں اور ادیبوں کو بھی کتم عدم سے عالم وجود میں لایا ہے، جنہوں نے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا کو اپنے کارناموں سے روشنی بخشی ہے۔ ایسی ہی جلیل القدر شخصیتوں میں علم و عمل کے پیکر، رفتار، گفتار اور کردار میں یکتائے روزگار، سادگی، انکساری اور خاکساری میں بے مثال، صالح فکر اور انسانی قدروں کے علم بردار، تاریخ و تحقیق میں نابغۂ روزگار، بے نفس عالم اور مورخ پروفیسر سید حسن عسکری مرحوم کی ذات والا صفات تھی جو اپنی زندگی ہی میں اساطیری کردار بن چکے تھے۔ انہوں نے صلہ اور شہرت سے بلند ہو کر نہایت خاموشی سے اپنے علمی اور تحقیقی کاموں کو انجام دیا۔

پروفیسر سید حسن عسکری اپنے آبائی گائوں، کجھوا ضلع سیوان (سابق ضلع سارن) میں ایک معزز اور تعلیم یافتہ زمیندار خاندان میں یکم ستمبر 1901ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید رضی حسن ان کے بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ رضیت بیگم نے جو ایک معاملہ فہم اور ذی شعور خاتون تھیں انہیں اعلیٰ تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے بڑے بھائی سید سلطان علی نے بھی حصول تعلیم میں ان کی سرپرستی کی۔ تعلیم کا آغاز مدرسہ اسلامیہ کجھوا سے کیا جہاں سے دینیات عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ چھپرہ ضلع اسکول میں داخل ہوئے اور 1918ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ڈسٹرکٹ جونیئر اسکالرشپ حاصل کیا اور جی بی بی کالج مظفر پور (موجودہ لنگٹ سنگھ کالج) سے 1922ء میں

ڈسٹنکشن کے ساتھ بی۔اے پاس کیا اور پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ایم۔اے کلاس میں داخلہ لیا۔ ہسٹری کا پوسٹ گریجویٹ میں یہ پہلا بیچ تھا 1924ء میں ایم اے پاس کرنے کے بعد وہ اسی یونیورسٹی سے 1925ء میں بی۔ایل کا امتحان بھی پاس کیا اور آرہ میں بحیثیت ایڈووکیٹ پریکٹس شروع کیا۔ اس پیشے سے ان کی طبیعت کو مناسبت نہیں تھی اس لئے اسے چھوڑ کر نیو کالج پٹنہ میں بحیثیت ٹیچر ملازمت کا آغاز کیا اور 1927ء میں پٹنہ کالج میں تاریخ کے لکچرر بحال ہوئے۔ وہ 1937ء میں اسسٹنٹ پروفیسر اور 1950ء میں یونیورسیٹی پروفیسر اور صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ کالج بحال ہوئے اور 1956ء میں بہار ایجوکیشن سروس کلاس ون سے سبکدوش ہوگئے لیکن جلد ہی یونیورسٹی نے ان کی ملازمت میں 1964ء تک توسیع کر دی۔ اس کے بعد ممتاز اساتذہ کو مالی معاونت کے لئے یو جی سی کی اسکیم کے تحت وہ 1974ء تک پوسٹ گریجویٹ ڈپارٹمنٹ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے اس اسکیم کے تحت کام کرنے والوں میں وہ بہار میں پہلے شخص تھے، جن کو یہ اعزاز ملا۔ پرفیسر سید حسن عسکری 1962ء سے 1969ء تک کاشی پرساد جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ کے اعزازی ڈائرکٹر رہے جسے گورنمنٹ آف بہار نے 1950ء میں ہندوستانی تاریخ میں تحقیقات اور تاریخی موضوعات پر کتابیں شائع کرنے کے لئے قائم کیا تھا۔

اس دنیائے آب و گل میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے، جنہیں زندگی میں اتنی مقبولیت اور ہر دل عزیزی ملی ہوگی۔ وہ زندگی ہی میں لیجنڈ بن چکے تھے۔ پروفیسر سید حسن عسکری کی زندگی اور ان کے کارناموں پر مورخوں، مداحوں، شاگردوں اور عزیزوں نے ان کی زندگی ہی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم بہار ریسرچ سوسائٹی نے اٹھایا جس کے وہ خود بھی ایک سرگرم رکن رہ چکے تھے۔ 1968ء میں اپنے جرنل کا اسپیشل ایشو Prof. S.H.Askari Felicitation Volume شائع کیا۔ اس والیوم میں ان کے عزیز ترین شاگرد اور جانشیں پروفیسر قیام الدین احمد نے ان کا ایک جامع سوانحی خاکہ اور انگریزی اور اردو مقالات کی فہرست شائع کی جن کی تعداد 127 تھی۔ اسی جلد میں پروفیسر آشیر وادی لعل شریواستو کا ایک دلچسپ تاثراتی مضمون بھی شامل ہے۔ سہ ماہی اردو معاصر پٹنہ میں ان کے بیشتر اردو مضامین شائع ہوئے جن میں خدا بخش لائبریری اور بہار اردو اکادمی پٹنہ نے الگ الگ کتابی شکل

میں شائع کیا ہے۔ مقامی انگریزی، ہندی اور اردو اخبارات نے مسلسل ان کی زندگی اور کارناموں پر بڑی تعداد میں مقالات شائع کیے۔ ڈیلی انڈین نیشن کے ایڈیٹر شری دینا ناتھ جھا جو ان کے عزیز شاگرد بھی تھے 15 اپریل 1969ء، 30 جنوری 1985ء، 30 جنوری 1987ء کے اخبارات میں ان کے کارناموں پر قیمتی مضامین شائع کیا۔ N.R. Ray نے بحیثیت ایڈیٹر ڈکشنری آف نیشنل بایو گرافی ان کی زندگی اور کارناموں کو شامل کیا۔ عسکری صاحب کے دوست اور مشہور مورخ پروفیسر جگدیش نرائن سرکار نے اپنی گرالقدر کتاب - Historiography Then & Now Medieval Bihar, K.P. Jaiswal, Institute Patna, 1989 میں ان کے کارناموں کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو زبان میں ان کی زندگی اور کارناموں کا تنقیدی جائزہ ان کے دوست اور ممتاز ناقد پروفیسر کلیم الدین احمد نے پیش کیا ہے جو ان کی آپ بیتی ''اپنی تلاش میں'' شامل ہے۔ اس کے علاوہ قاضی عبدالودود، اختر اورینوی، ڈاکٹر محمد حسنین نے بھی اپنی تحریروں میں بار بار ان کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے آخری دور کے عزیز ترین شاگرد امتیاز احمد نے Obituary لکھی جو ہندوستان ٹائمز پٹنہ میں شائع ہوئی اور اردو میں ان کی زندگی اور کارناموں پر ایک طویل اور پُر مغز مقالہ تحریر کیا جو بہار لیجس لیٹیو کونسل کے جرنل میں شائع ہوا۔ انڈین ہسٹوریکل ریویو جلد XVI میں انہیں پُر زور خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر وجئے کمار چودھری نے اپنی ادارت میں Reading in History — Syed Hasan Askari Centenary Volume ۲۰۰۱ء میں شائع کیا۔ اس والیوم کے مرتبین ڈاکٹر وجے کمار ٹھاکر اور ڈاکٹر امتیاز احمد تھے۔ یہ والیوم دستاویزی حیثیت کی حامل ہے اور اس میں انگریزی اور ہندی زبانوں میں مشہور دانشوروں اور تاریخ دانوں کے مضامین اور سبھی کارناموں کی ایک جامع فہرست بھی ہے جس کی تیاری میں راقم الحروف نے بھی حصہ لیا مقالات کی تعداد 350 سے زیادہ ہے۔ عسکری صاحب کی دختر نیک اختر محترمہ عقیلہ فاطمہ کی کتاب ''سید حسن عسکری۔ یادوں کے آئینے میں'' نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ جذبات واحساسات سے بھرپور مصنفہ نے اپنے والد مرحوم کی رزمرہ اور گھریلو زندگی کی نہایت خوبصورت عکاسی کی ہے۔

ہندی زبان میں ہندی اخباروں اور رسالوں کے علاوہ ڈاکٹر جیئے شری مشرا کی کتا''ب بہار کے دیونگت اتہاس کار اور ان کی لیکھنی'' میں عسکری صاحب کی زندگی اور کارناموں پر ایک پُرکشش تحریر ہے۔

خود پروفیسر سید حسن عسکری نے اپنے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ لیکن اپنے دوست ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت کے متعلق اپنے مضمون مطبوعہ جرنل آف بہار ریسرچ سوسائٹی مجلد LIX صفحات XXVII-XXX میں انہوں نے اپنی ابتدائی تحریروں کے متعلق لکھا ہے کہ کس طرح ان کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ڈاکٹر ایس۔ سی۔ سرکار نے کلکتہ سے آئے اسکالر کے۔ کے۔ دت کے لئے خدابخش لائبریری میں محفوظ فارسی مخطوطات پڑھنے کے لئے انہیں آمادہ کیا۔ وہ مدد کرنے لگے اور اسی دوران ان کی فارسی مخطوطات سے دلچسپی بڑھی اور 1936ء سے انہوں نے خود لکھنا شروع کر دیا اور تاریخی تحقیقات کے کام میں اس قدر غرق ہو گئے کہ زندگی بھر یہ ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ 1938ء میں وہ پہلی بار انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس دوم منعقدہ الٰہ آباد میں شریک ہوئے اور اس کے بعد مختلف حیثیتوں سے وہ اس ادارے سے وابستہ رہے۔ 1947ء کے بمبئی سیشن ہندوستان کے عہد وسطیٰ کے سیکشن کی صدارت کی اور 1968ء کے وارانسی سیشن کے لئے وہ اس کے جنرل پریسیڈنٹ منتخب کئے گئے لیکن اپنی سادگی اور انکساری کے باعث اس بڑے اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور معذرت کر لی۔

پروفیسر سید حسن عسکری کی ابتدائی تحقیقاتی تحریروں میں ہند عہد وسطیٰ کی عمومی تاریخ اور بہار کی علاقائی تاریخ کا زیادہ تذکرہ ملتا ہے۔ 1946ء میں ان کی توجہ صوفیائے کرام کی زندگی کے حالات ان کے مخطوطات اور مکتوبات کی طرف مبذول ہوئی اور یہ ان کا ایک مستقل موضوع بن گیا۔ اور انہوں نے صوفیائے کرام کی تحریروں میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری، لسانی اور ثقافتی یکسانیتوں کی نشاندہی کی۔ انہوں نے اپنی تحقیقات کو صرف لائبریری اور یونیورسٹی تک محدود نہیں رکھا۔ وہ مخطوطات اور تاریخ کے نئے ماخذوں کی تلاش میں اکثر دور دراز علاقوں اور انجان جگہوں کا سفر کرتے رہتے تھے۔ ایسے سفروں میں وہ کبھی تنہا کبھی ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت اور زیادہ تر قیام الدین صاحب اور کبھی ڈاکٹر حسنین اور کبھی کسی اور کے ساتھ سفر کرتے۔ ان مہمات میں جو

پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنی پڑتیں اس کا تذکرہ خود انہوں نے کبھی نہیں کیا لیکن قیام الدین صاحب اور حسنین صاحب اکثر تذکرہ کیا کرتے تھے کہ کس طرح کسی اونچی دیوار پر نصب کتبے کو پڑھنے کے لئے وہ بانس کی کمزور سیڑھی پر چڑھ جاتے تھے اور کبھی کسی کنویں میں لگے کتبے کو پڑھنے کے لئے وہ کسی ٹوکری یا لکڑی کے کمزور تختوں کو رسی میں باندھ کر بے جھجک کنویں میں اتر جاتے تھے اور کامیابی کے بعد بہت خوش ہوتے تھے۔

پروفیسر سید حسن عسکری نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے موضوعات پر بے شمار مقالے تحریر کیے جن کی تعداد ساڑھے تین سو سے زیادہ ہے جن میں زیادہ اہم وہ تحریریں ہیں جو انہوں نے ہندوستان کی مذھبی، لسانی، تہذیب و ثقافت، صوفیائے کرام کے مکتوبات اور ملفوظات اور امیر خسرو کی تاریخی، ادبی اور لسانی اہمیت کے متعلق لکھی ہیں۔ سبکدوشی کے بعد پروفیسر عسکری نے چار نہایت اہم فارسی مخطوطات کی تدوین اور انگریزی ترجمے کا کام انجام دیا۔

1۔ شاہ نامہ منور کلام مصنفہ شیوداس لکھنوی

2۔ اقبال نامہ۔ یہ کسی غیر معروف مورخ کی تصنیف ہے جو عہد مغلیہ کے دور زوال کے لئے اہم ماخذ ہے

3۔ واقعات بابری مصنف زین الدین۔ اس کتاب میں بابر اور اس دور کے متعلق اہم معلومات ہیں مطبوعہ خدابخش 1993۔

4۔ سیرتِ فیروز شاہی ایک نامعلوم مصنف کی نہایت وقیع تصنیف ہے جو فیروز شاہ تغلق کی زندگی اور کارناموں کے متعلق ایک اہم ماخذ ہے۔ دنیا میں اس کا صرف ایک ہی نسخہ خدابخش لائبریری میں محفوظ ہے۔

5۔ عسکری صاحب نے قیام الدین احمد صاحب کے ساتھ ملکر دو جلدوں میں Comprehensive History of BiharVol.II, Part-I (1983) اور

6۔ Part-II (1987) ایڈٹ کیا جن میں ان دونوں کے وقیع ابواب بھی شامل ہیں۔

7۔ Aspects of the Cultural History of Medieval Bihar- KP JRI Patna (1986)

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے ان کے مقالات کے مجموعوں کو مختلف عنوانوں سے شائع کیا جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ مکتوبات وملفوظات لٹریچر (1981)

2۔ کلکٹیڈ ورکس آف پروفیسر عسکری (collected works of Hasan Askari) (1985)

3۔ اسلام اینڈ مسلمس ان میڈیول بہار (Islam & Muslim is medeval Bihar) (1989)

4۔ میڈیول بہار سلطنت اینڈ مغل پیریڈ (Medival Bihar Saltanat & Mughal perion) (1990)

5۔امیر خسرو، ایزاے ہسٹورین(Amir Khusro as a historian)(1992)

پروفیسر سید حسن عسکری صلہ وشہرت سے بلند ہو کر خاموشی سے اپنے تحقیقی کاموں کو فرض اور عبادت سمجھ کر انجام دیتے رہے لیکن انعامات اور اعزازات بھی ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہے۔ برطانوی حکومت نے انہیں پٹنہ کالج اور اس کی لائبریری کو فسادیوں سے بچانے کے صلے میں 1947ء میں خان صاحب کے خطاب سے نوازا1967ء میں مگدھ یونیورسٹی نے انہیں شری جے پرکاش نارائن اور راجارادھیکار من کے ساتھ ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ 1968ء میں پٹنہ یونیورسٹی نے بھی انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1971ء میں رضا شاہ پہلوی، شاہ ایران نے انہیں اہلیہ کے ساتھ مدعو کیا تاکہ وہ اس جشن میں شرکت کریں جو ایران میں شہنشاہیت کی 2500 صدی کی تکمیل پر منعقد کی جارہی تھی مگر وہ شرکت پر راضی نہیں ہوئے۔1975ء میں صدر جمہوریہ ہند فخر الدین علی احمد نے انہیں غالب ایوارڈ سے نوازا۔ 1978ء میں صدر نیلم سنجیوا ریڈی نے فارسی زبان وادب کی خدمات کے صلے میں انہیں اعزازی

سند سے سرفراز کیااور 1985 میں صدر گیانی ذیل سنگھ نے پدم شری کے خطاب سے ان کی عزت افزائی کی۔ 1987ء میں حکومت بہار نے بہار رتن کا خطاب عطا کیا۔ 1979ء میں بہار اردو اکادمی نے ان کی اردو زبان وادب کی مجموعی خدمات کے لئے عزت افزائی کی۔

پروفیسر سید حسن عسکری کا تعلق تاریخی تحقیقی اور علمی اداروں سے لمبے عرصے تک رہا۔ وہ بیس سالوں سے بھی زیادہ بہار ریسرچ سوسائٹی کے نہایت متحرک اور فعال رکن اور اس کے جرنل کے ادارتی بورڈ میں شامل رہے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیول انڈیا کواٹرلی کے بھی ایک رکن کی حیثیت سے ادارتی بورڈ میں شامل رہے۔ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کے وہ ریگولر وزیٹر تھے اور اس کے نایاب علمی ذخیروں اور مخطوطات سے جتنا استفادہ انہوں نے کیا شاید ہی کسی دوسرے نے کیا ہو۔ وہ کئی دہائیوں تک اسکی گورننگ باڈی کے رکن رہے اور اکثر اس کے علمی ڈخیروں میں اضافے کا سبب بنے اور کچھ اپنے ذاتی بیش قیمت مخطوطات بھی لائبریری کو بطور عطیہ دیا۔ وہ حکومت ہند کی قائم کردہ دس ممتاز مورخین کی کمیٹی کے ایک رکن تھے جسے نظر ثانی شدہ گریٹیر آف انڈیا میں شامل تاریخی مواد پر تبصرہ کرنا تھا۔ وہ 1965ء میں اس کی تشکیل ہی سے ریجنل ریکارڈس سروے کمیٹی کے نہایت متحرک رکن، اس کے اعزازی سکریٹری (1962-1966) اور اعزازی صدر (1981-88) رہے۔ یہ ان کا پسندیدہ ادارہ تھا اور ہمیشہ اس کی افادیت بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کی طرف سے انہیں مدعو کیا گیا۔ زیادہ تر تو انہوں نے انکار کر دیا لیکن 1985ء میں کلکتہ یونیورسٹی کی دعوت پر سر عبداللہ سہروردی میموریل لکچر اور ایران سوسائٹی کلکتہ کی جانب سے اسحاق میموریل لکچر دیا۔ 1975ء میں انہوں نے بہار ریسرچ سوسائٹی کے سالانہ جلسے میں صدارتی خطبہ پیش کیا۔ 1976ء میں خدا بخش سالانہ خطبہ پیش کیا۔ 1985ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی دعوت پر انہوں نے انصاری میموریل لکچر پیش کیا اور 1986ء میں کے۔پی۔ جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر جیسوال میموریل لکچر دیا۔ تقریباً تمام لکچر شائع ہو چکے ہیں۔

پروفیسر سید حسن عسکری کی علمی اور تحقیقی شہرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ سبھی علمی بالخصوص تاریخ نویسی کے کاموں میں ان کی مدد لازمی سمجھی جاتی تھی۔ بہار کے سبھی گورنر بالخصوص شری آر۔آر دیواکر ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی اور پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ایس سی مشرا، جسٹس سید سرور علی، جسٹس کے بی این سنگھ، جسٹس ولی الدین احمد اور بیوروکریٹس میں شری ایس۔ وی۔ سوہنی، شری محبوب عالم، شری ارون پاٹھک اور شری کمار سریش سنگھ، ایس کیو رضوی، سید فضل احمد، سید علی عباس، رضا کریم رضا، اچاریہ کشور کنال، ان کے بڑے قدردانوں اور مداحوں میں تھے۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمن قدوائی کی خواہش پر کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نے سید حسن عسکری میموریل لکچر شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے خطبے کے لئے پروفیسر قیام الدین احمد کی منظوری لے لی گئی تھی۔ جس کا انعقاد نومبر 1998ء طے کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے اگست 1998ء ہی میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا اور یہ پروگرام التوا میں پڑ گیا۔

لیکن حکومت بہار کے ایک دوسرے ادارے Bihar Archives نے جو کینٹ سکریٹریٹ کے ماتحت ہے پدم شری پروفیسر سید حسن عسکری میموریل لکچر کا آغاز کیا۔ اس کے متعدد لکچرز ہو چکے ہیں۔ 2015 کا لکچر پروفیسر بھارتی اس کمار، 2016 کا ڈاکٹر امتیاز احمد نے اور 2017 کا لکچر راقم الحروف نے بعنوان ''پورنیہ کا اتہاس اور سنسکرتی صدیوں کے آئینے'' میں پیش کیا۔ اس موضوع کے انتخاب کی اصل وجہ یہ تھی کہ علاقائی تاریخ و ثقافت پر تحقیقاتی کاموں کی طرف انہوں نے ہی مجھے ترغیب دی اور حوصلہ افزائی کی۔ اور ایک وسیع موضوع Muslim Settlement in North Bihar میرے لئے پسند کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پورنیہ کی تاریخ و ثقافت کے مختلف پہلوئوں پر میں نے تقریباً ایک درجن سے زیادہ مقالے لکھے اور انہیں شائع کرایا۔

پروفیسر سید حسن عسکری کے آباواجداد تیرھویں صدی عیسوی میں بخارا سے ہندوستان آئے اور اورنگزیب کے عہد (1658-1707) میں بادشاہ نے اس خاندان کو مدد معاش کے طور

پر جنگلوں سے بھری لاخراج زمین بی بی بدی کے نام پر عطا کی۔ اس فارسی دستاویز کا اردو ترجمہ محترمہ عقیلہ فاطمہ نے اپنی کتاب میں پیش کیا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہے۔

''اس وقت یہ فرمان صادر ہوا کہ 200 بیگھا زمین افتادہ لائق زراعت خاص پرگنہ آندر، سرکار سارن علاقہ صوبہ بہار کی مسماۃ بی بی بدی (بی بی بڑی) وغیرہ کی وجہ مدد معاش میں مندرجہ شرائط کے ساتھ مقرر ہے کہ اس کی پیداوار کو اپنی ضرورتوں میں کام لائیں اور حکومت کی بقا کے لئے ہمیشہ دعا کریں۔ لہٰذا چاہئے کہ حکام، عمال، جاگیرداراں اور حال اور مستقبل مذکورہ اراضی کو ناپ کر اور چک بندی کر کے ان لوگوں کے تصرف میں چھوڑ دیں اور کسی قسم کا تغیّر اور تبدیلی اس میں نہ کریں اور حاصل واجبات اور دوسرے اخراجات میں کوئی مزاحمت نہ کریں اور اس بارے میں ہر سال نئی سند طلب کریں اور اگر دوسری جگہ کوئی چیز ہو تو اس کا اعتبار نہ کریں۔ (16 صفر 27 جلوس والا)۔

پروفیسر سید حسن عسکری کی جائے پیدائش کجھوا سادات کی ایک چھوٹی سی بستی ہے جہاں کوس اور جھوّا کے پیڑوں نے اسے گھنے جنگل میں تبدیل کر دیا تھا۔ اسے بسانے کا شرف اس خاندان کے ایک فرد پیر محمد کو حاصل ہوا۔ جنہوں نے جنگلوں کو صاف کرایا۔ کوس اور جھوّا کی آمیزش سے اس گائوں کا نام کجھوہ رکھا۔ اس خاندان کا نسبی تعلق حضرت جلال الدین بخاری جہانیان جہاں گشت تک پہنچتا ہے۔ جہانیاں جہاں گشت کی اولاد میں سید محمد عبداللہ برہان الدین سادات کجھوا کے مورث اعلیٰ تھے جن کے دو فرزندوں سید جعفر علی اور سید قابل علی نے کجھوا میں سکونت اختیار کی۔ سید قابل علی کے صاحبزادے پروفیسر عسکری کے والد سید رضی حسن اور ان کے خسر سید رضا حسین سگے چچازاد بھائی تھے۔

پروفیسر عسکری کی دو شادیاں ہوئیں پہلی شادی زہرا فاطمہ بنت رضا حسین کے ساتھ دور طالب علمی میں ہی انجام پا گئی تھی اور اس کے انتقال کے بعد سید رضا حسین صاحب نے اپنی دوسری بیٹی محترمہ ام سلمہ کو 1926ء میں ان کے نکاح میں دے دیا جن سے تین صاحبزادے اور چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں سبھی تعلیم یافتہ اور خوشحالی کی زندگی گذار رہے ہیں۔

پروفیسر سید حسن عسکری کے شوق اور پسندیدہ مشغلے بھی قابل ذکر ہیں۔ ان میں نمایاں طور پر ان کے سائیکل کی سواری تھی جو ریٹائرمنٹ کے بعد تک جاری رہی اور آخری دنوں میں وہ سائیکل کی ہینڈل پکڑ کر چلتے تھے اور واپسی میں گائے کے لئے کیریئر پر گھاس لے کر واپس آتے تھے۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ ایک دفعہ پیر بہور تھانہ کے پاس کسی سپاہی نے سائیکل میں بتی نہ رہنے کے سبب انہیں روک کر تھانے میں بیٹھا دیا۔ تھانے کے داروغہ کی نظر جب ان پر پڑی تو اپنے محترم استاد کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ معلوم ہونے پر بڑی لجاجت سے معذرت خواہ ہوا اور انہیں رخصت کرنے باہر تک آیا۔

انہیں گائے پالنے اور اس کی دیکھ بھال خود کرنے کا بہت شوق تھا۔ ہندو عقیدتمند انہیں کرشن بھکت کہا کرتے تھے۔ گائے کو رانی گھاٹ میں نہلانے اور اس کے چارہ پانی اور دوہنے کا کام خود کرتے تھے اور پڑوسیوں میں بھی دودھ تقسیم کرواتے تھے۔ انہیں کھیلوں سے بھی دلچسپی تھی۔ جوانی کے دنوں میں بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ پروفیسر کلیم الدین احمد نے بڑی تفصیل سے ان معمولات کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں جب کھیلنا چھوٹ گیا تو ہند۔ پاک ہاکی میچ کی کمنٹری سنتے تھے لیکن انہیں کرکٹ سے دلچسپی نہیں تھی۔ کچھ دنوں تک انہیں فلم بینی کا شوق بھی رہا جو ان دنوں تفریح کا سب سے مقبول ذریعہ تھا۔ جب فلم بینی چھوٹ گئی تو ہلکے پھلکے جاسوسی اور رومانی ناولوں سے دل بہلاتے تھے۔ روزانہ شام کو پروفیسر عبدالمنان بیدل کے گھر ریڈیو سننے جایا کرتے تھے۔ جہاں بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقات بھی ہو جایا کرتی تھی۔

پروفیسر سید حسن عسکری شیعہ مسلک کے پیرو تھے اور اہل بیت اور ائمہ معصومین سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن مسلکی معاملات میں کبھی شدت پسند نہیں رہے۔ روزہ اور نماز کی پابندی ہمیشہ کرتے تھے جب تک صحت مند رہے نوافل کے روزے بھی پابندی سے رکھتے تھے اور ہر جمعہ کو ہمیشہ روزہ کے پابند رہے اور روزے کی حالت میں بھی معمولات زندگی میں کبھی فرق نہیں آنے دیا۔ روزہ کی حالت میں بھی وہ اکثر سائیکل سے پھلواری شریف اور داناپور تک چلے جایا کرتے تھے۔ وہ نماز کے بھی سخت پابند تھے اور اکثر ملا شادمان کی مسجد میں نمازیں ادا کیا کرتے تھے۔ پروفیسر قیام الدین صاحب نے لکھا ہے کہ اکثر ٹرین کے سفر میں جب ان کے دوست ڈاکٹر کے۔ کے۔ دت بھی شریک

سفر رہتے تو اگر کسی اسٹیشن پر ٹرین رکتی تو وہ پلیٹ فارم پر مصلیٰ بچھا کر نماز میں مشغول ہو جاتے اور ڈاکٹر دت پریشان ہو جاتے کہ کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔

پروفیسر سید حسن عسکری اپنے شاگردوں سے بے حد محبت کرتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جو پٹنہ میں نہیں رہتے تھے ان میں ایک اہم نام پروفیسر بملا پرساد کا ہے جو ہر سال بلاناغہ دو کیلو میٹھائی کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر آتے اور دو۔ تین گھنٹے ان کے ساتھ ضرور رہنا پسند کرتے تھے۔ عسکری صاحب اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے انہیں دعائیں دیتے تھے۔ ایک اور واقعہ کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ عسکری صاحب خدابخش لائبریری میں کسی مخطوطے کے مطالعہ میں مصروف تھے۔ میں لائبریری کے اندر کچھ کام کر رہا تھا کہ میرے محترم استاد پروفیسر قیام الدین احمد صاحب کا لائبریری میں میرے لئے ایک فون آیا۔ میں نے جب فون اٹھایا تو انہوں نے فرمایا میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو اور عسکری صاحب کو احتیاط سے یہ خبر دے دو کہ وشنو انو گرہ نرائن کا ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ عسکری صاحب یہ خبر سنتے ہی چیخ چیخ کر رونے اور سینہ کوبی کرنے لگے۔ 'ہائے وشنو، وائے وشنو، اب وشنو نہیں رہا۔ میرا پیارا وشنو نہیں رہا، بہر حال کسی طرح رکشے پر بیٹھا کر میں نے انہیں ان کے گھر تک پہونچا دیا مگر افسوس کہ اس کے بعد وہ لائبریری آنے کے لائق نہیں رہے۔

عسکری صاحب 1927 کو بحیثیت لکچرر پٹنہ کالج میں بھی بحال ہوئے تھے۔ اس کے بعد جتنے لوگوں نے پٹنہ کالج میں تعلیم حاصل کی، اور جن کا سبجیکٹ ہسٹری رہا وہ ان کے شاگرد رہے۔ ایسے لوگوں میں پروفیسر عطا گور، پروفیسر اختر اورنیوی، پروفیسر چنتکر جھا، پروفیسر بی پی ورما، پروفیسر رام شرن شرما، پروفیسر یوگیندر مشرا، پروفیسر بی پی مزمدار، پروفیسر قیام الدین احمد، پروفیسر سریندر گوپال اور پروفیسر ڈی این جھا۔

پروفیسر جے سی جھا نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، پروفیسر کلیم الدین احمد براہ راست ان کے شاگرد نہ ہو سکے کیوں کہ انکا آنرس انگریزی اور پاس کورس اکنامکس اور عربی تھے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے عسکری صاحب کے متعلق ایک واقعے کا تذکرہ کیا ہے، وہ یہ کہ تقسیم ہند سے قبل پٹنہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا ماحول تھا۔ کچھ شر پسندوں نے ایک مسجد کے

احاطے میں جہاں عسکری صاحب نماز ادا کرتے تھے بم وغیرہ چھپا کر رکھ دیا۔ پولس کی تلاشی میں یہ سارا سامان برآمد ہو گیا۔ ان باتوں سے بے خبر عسکری صاحب جب نماز ادا کرنے پہنچے تو پولس نے انہیں گرفتار کر لیا۔ لیکن اتفاق سے ڈی ایس پی ان کا شاگرد نکلا۔ اس نے پولس عملوں کو ڈانٹ پلائی اور کہا کہ اگر خرگوش ہی پکڑنا تھا تو پروفیسر صاحب کو کیوں پریشان کیا؟ اسی مسجد سے متصل قبرستان میں عسکری صاحب کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین ہوئی۔ گولک پور میں واقع ملا شادمان کی اس مسجد کی ایک تاریخی اہمیت یہ بھی ہے کہ مغل بادشاہ فرخ سیر نے عظیم آباد میں اپنی تخت نشینی کا اعلان کرنے کے بعد اسی مسجد میں نماز ادا کی تھی۔

راقم الحروف پورنیہ کے ایک دور افتادہ گاؤں سے بغرض حصول تعلیم اگست، 1966 میں پٹنہ آیا اور یہاں آکر پٹنہ میں موجود مشاہیر علم وادب پروفیسر کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، سید حسن عسکری، عبدالمنان بیدل، عبدالمجید شم، س اختر اورینوی، جمیل مظہری عطا کاکوی، کلیم عاجز، غلام سرور کو دیکھنے اور سننے کے مواقع ملے۔ پروفیسر عسکری علمی قابلیت، عمیق مطالعہ انسانی قدروں کے علمبردار اور سادگی کے نادر نمونہ تھے۔ وہ ہمیشہ شیروانی پائجامہ اور سر پر ایک سیاہ ٹوپی پہنے اپنی پرانی سائیکل کا ہینڈل تھامے پٹنہ یونیورسٹی، خدابخش لائبریری، کے۔ پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور پھلواری شریف آتے جاتے اکثر عوام وخواص کے مرکز نگاہ ہوتے تھے۔ سب سے پہلے انہیں ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی میں پروفیسر عطاءالرحمن کاکوی کی دعوت پر مجلس ادب کی جانب سے منعقد ایک مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن میرا تعلق ان سے اس وقت قائم ہوا جب میں ایم اے ہسٹر کے لیے پٹنہ یونیورسٹی 1972-1974 بیچ میں ان کا باضابطہ شاگرد بنا۔ اس کے بعد ان کی افسوس ناک وفات 1990ء تک مسلسل ان کی خدمت میں حاضری دیتا رہا۔ اور ہمیشہ ان کی محبت، شفقت، اعتماد، رہنمائی اور سرپرستی مجھے حاصل رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے میری ملازمت میں بھی دلچسپی لی اور میری خانگی زندگی کے خوشی اور غم میں بھی برابر شریک رہے۔ میری بحالی پورنیہ کے ایک نئے کانسٹی چیونٹ کالج میں پکی تھی۔ جیسے ہی انہیں یہ خبر ملی تو انہوں نے فرمایا۔ ''بھئی دیکھو تمہارے اندر، میں پڑھنے لکھنے کے جراثیم دیکھ رہا ہوں۔ وہاں جا کر اپنے علاقے کی سیاست میں پڑ جائو گے اور وہاں ایسا کوئی ادارہ یا لائبریری بھی

نہیں ہے جس سے اپنی علمی پیاس بجھا سکو۔ اس ارادے کو ملتوی کرو اور پٹنہ میں ہی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرو"۔

عسکری صاحب سے تبادلہ خیال کے بعد میں نے اپنے محترم استاد پروفیسر قیام الدین احمد صاحب کو یہ باتیں بتائیں تو وہ بولے کہ عسکری صاحب مجھ سے کہہ چکے ہیں، وہ اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی کے اہم ترین اراکین میں تھے۔ میری بحالی جنوری 1979ء میں ہو گئی، عسکری صاحب اور فیاض الدین حیدر صاحب اکسپرٹ کی حیثیت سے اپوائنٹمنٹ کمیٹی میں شامل تھے۔

ایم۔اے میں میرا اسپیشل پیپر عہد وسطیٰ کا ہندوستان تھا جس میں تین پیپرز ہوا کرتے تھے چونکہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے مطالعے زیادہ تر مآخذ فارسی اور عربی زبانوں میں ہیں اس لئے اس میں طلبا کی تعداد قدیم ہندوستان، جدید ہندوستان اور انٹر نیشنل ریلیشن کے مقابلے میں کم رہتی تھی۔ تاہم میرے بیچ میں [ساتھیوں میں] امتیاز احمد، انور احسان اور مدھو بالا یاگنک جیسے غیر معمولی ذہانت کے طلبا بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ عبدالخالق خان، ہریندر کمار، پہاڑی سانیال، کرشن پرتاپ اور خود میں تھا۔ آٹھواں پیپر پولیٹکل اور ایڈمنسٹریٹیو ہسٹری پروفیسر قیام الدین احمد، ساتواں پیپر ریلیجنس اور کلچرل ہسٹری پروفیسر عسکری اور آٹھواں پیپر سوشیو۔ اکنامک ہسٹری پروفیسر سریندر گوپال پڑھایا کرتے تھے۔ عسکری صاحب نے البیرونی کے ہندوستان کے متعلق مشاہدات، تصوف اور بھکتی تحریک، اردو، ہندی اور بنگلہ زبانوں کی ابتدا اور ترقی، مصوری اور فن تعمیرات کے موضوعات کو پڑھایا۔ ان کی انگریزی مشکل ہوتی تھی لیکن کلاس کے بعد امتیاز احمد، انوار احسان اور مدھو بالا یاگنک سے نوٹ حاصل کر کے اسے محفوظ کر لیا کرتا تھا۔ یہ لکچر اس قدر پُر مغز ہوا کرتے تھے کہ دوسری کتابیں دیکھنے کی کم ہی نوبت آتی تھی۔ پوسٹ گریجویٹ پاس کرنے کے بعد مجھے گورنمنٹ آف انڈیا کی ایک اسکالر شپ مل گئی اور مجھے یحییٰ قزوینی کی کتاب لُبّ التواریخ ایڈٹ کرنا تھا باضابطہ گائیڈ پروفیسر فیاض الدین حیدر صاحب تھے لیکن زیادہ تر کام میں نے قیام الدین صاحب اور عسکری صاحب کی نگرانی میں انجام دیا۔ اس کے بعد پی ایچ ڈی کے لئے انہوں نے Muslim Settlement in North Bihar پر کام کرنے کے لئے کہا لیکن اس وسیع موضوع پر کام کرنا آسان نہیں تھا اور قیام صاحب کے مشورہ سے انہیں کی نگرانی

میں امیر الامرا شائستہ خان پر رجسٹریشن کرایا۔ لیکن عسکری صاحب کے موضوع کو میں نے فراموش نہیں کیا اور سرکار پورنیہ یعنی موجودہ سیمانچل جن میں پورنیہ، کشن گنج، ارریہ اور کٹیہار ضلع شامل ہیں، کے مختلف پہلوئوں پر دس سے زیادہ مقالے تیار کیے اور انہیں شائع کرایا۔

ایک لمبے عرصے تک سلطان گنج میں فیملی کے ساتھ رہا۔ عسکری صاحب خان مرزا محلہ میں رہتے تھے۔ اور اکثر صبح سویرے ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ میری اہلیہ کو جونڈیس ہو گیا۔ کسی نے ان سے تذکرہ کر دیا بس کیا تھا ہمیشہ کچھ نہ کچھ دوائیاں اور جڑی بوٹیاں بھیجواتے رہتے تھے۔ جب تک وہ صحتمند نہیں ہوئی عسکری صاحب پریشان ہوتے رہے۔ میرے بڑے بیٹے عرفان انوار کے عقیقے میں انہیں بلایا تو وہ نہایت خوشی سے شریک ہوئے اور بچے کو دعائیں دیں اور گراں قدر تحفے سے نوازا۔ اس تقریب میں پروفیسر قیام الدین صاحب، پروفیسر شمشاد حسین، غفار صدیقی، امتیاز احمد، جمیل اور رضوان بھی شریک تھے۔ بعد میں میری اہلیہ تسنیم کوثر نے ان کی شخصیت پر ایک دلچسپ مضمون بھی لکھا جو جیسوال انسٹی کے عسکری میموریل والیوم میں شائع ہوا۔

صبح سویرے ان کی فراغت کا وقت ہوتا تھا، ان کے بہت سے پرانے شاگرد، دوست اور مداح ان سے ملنے آتے تھے تو وہ مجھے روک لیتے تھے اور میں ان لوگوں کی آپسی گفتگو کو غور سے سنتا رہتا تھا۔ ایک حضرت جو خود بڑے محقق تھے ان سے ان کے مقالے "مَلِک بیّو" پر اعتراض کیا تو عسکری صاحب نے نہایت تحمل سے جواب دیا کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ آپ کی فیلنگس ہیں اور میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ میری فائنڈنگس ہیں۔ اور تحقیق میں کچھ بھی حرف آخر نہیں ہوتا ہے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے غلط لکھا ہے تو آپ تحریری طور پر اس کی تردید کر دیجئے۔ وہ خاموش ہو گئے۔

دو تین سال پہلے دوردرشن پٹنہ کی طرف سے عسکری صاحب پر ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ قاسم خورشید صاحب نظامت کر رہے تھے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر وجئے کمار چودھری اور راقم الحروف اس میں شامل ہوئے تھے۔ ہم سبھوں کی گفتگو سے یہ بات سامنے آئی ان کی وفات کو پچیس تیس سال گذر جانے کے بعد بھی ان کی یادیں اور باتیں لوگوں کے دلوں میں اسی طرح تازہ ہیں جیسے ان کی زندگی میں تھیں۔

جب شاہ بانو کیس چل رہا تھا کچھ صحافی متواتر ان کی رائے جاننے کے لئے ان کے پاس آتے تھے۔ پہلے تو انہوں نے منع کر دیا جب بضد ہو گئے تو انہوں نے صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا میں ہسٹری کا ایک معمولی طالب علم ہوں آپ جو کچھ مجھ سے پوچھ رہے ہیں اس کا تعلق شریعت سے ہے میں شریعت کا جانکار نہیں ہوں۔ بھلا میں کیا بتا سکتا ہوں؟

عسکری صاحب کی تحریریں غیر ملکی اسکالروں کے درمیان بے حد مقبول تھیں۔ وہ لوگ ہمیشہ رابطہ میں رہنا چاہتے تھے۔ ان میں سے بعض تو بار بار ان سے ملنے اور استفادہ کرنے آتے۔ جن میں فلٹز لیمن، کرسچین ڈبلیو ٹرول، بابرہ میٹکاف، بروس لارنس اور فادر پال جیکسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر نے ان کے ساتھ باضابطہ 1976ء میں مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی مکتوبات صدی پر ان کے ساتھ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے رجسٹریشن کرایا۔ ڈگری بھی ملی اور کتاب بھی چھپی اور بہت مقبول ہوئی۔ وہ عسکری صاحب کو سکنڈ فادر کہا کرتے تھے۔ ایک تاثراتی مضمون میں انہوں نے لکھا ہے۔

"The care and Love I had experienced at his hands was all and more than any son could hope to experience from a loving frather."

پروفیسر سید حسن عسکری 90 سال کی بامقصد اور کامیاب زندگی گذارنے کے بعد 28 نومبر 1990ء کی شب اپنے رب حقیقی سے جا ملے اور 29 نومبر کو گولک پور کی ملا شادمان کی مسجد میں نماز جنازہ پڑھائی گئی اور اس سے متصل قبرستان میں تجہیز و تکفین عمل میں لائی گئی جس میں بلا تفریق مذہب و ملت عوام و خواص عزیز و اقربا، شاگرد و مداح بہت بڑی تعداد میں شامل ہوئے تھے۔ ہندوستان بھر کے بڑے بڑے سیاسی قائدین، مورخین، علماء صلحا اور سماجی کارکنوں نے تعزیتی پیغامات بھیجے۔ ان کے شاگرد پروفیسر یوگیندر مشرا نے بقول امتیاز احمد فرمایا "لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی کا شمار برسوں میں نہیں کارناموں میں ہوتا ہے مگر عسکری صاحب کی زندگی کا شمار برسوں سے بھی ہوگا اور کارناموں سے بھی۔

متعدد شعراء نے قطعہ تاریخ وفات کہا۔ پروفیسر یوسف خورشیدی نے کہا:

وہ درویش کامل، مورخ، محقق وہی نام جن کا حسن عسکری ہے
وہ رخصت ہوئے ہائے دنیا سے یوسف صدا بَین کی مستقل آرہی ہے
اگر آپ سے کوئی تاریخ پوچھے تو کہئے یہی روضۂ عسکری ہے

پروفیسر کلیم عاجزؔ نے تعزیتی نظم لکھی:

ذوقِ افسانہ ماضی نہ رہا میرے بعد کوئی تاریخ کا ماہر نہ رہا میرے بعد
آیئے راہ میں یوں ہی پڑے رہ جائیں گے کون پہچانے گا نقش کف پا میرے بعد

پروفیسر سید موسیٰ رضا نے کہا:

خاکساری ، انکساری، بردباری، سادگی جب ہوئی یکجا مجسم، تھی شکل عسکری
موجزن تھا گرچہ سینہ میں سدا ایک بحر علم تشنگی علم آخر سانس تک باقی رہی

ان کی صاحبزادی محترمہ عقیلہ فاطمہ نے کہا:

خاکساری ، انکساری، بردباری، سادگی جب ہوئی یکجا مجسم، تھی شکل عسکری
موجزن تھا گرچہ سینہ میں سدا ایک بحر علم تشنگی علم آخر سانس تک باقی رہی
علم کو جنھوں نے کیا سرخرو عمل دے کر(کنا) وہ مر گئے ہمیں جینے کی آرزو دے کر

پروفیسر سید حسن عسکری کی موت کے ساتھ ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا اور میرے ہونٹوں پر یہ مصرعہ بے ساختہ آگیا: 'زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'

دعا ہے اللہ پاک انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے۔

***

پروفیسر منظر اعجاز

اقبال اور تصوف

تصوف مذاہب کی روح ہے جو رنگ، نسل اور تہذیب کے فرق کے باجود کم وبیش یکساں طور پر جاری رہی- اصل کی طرف پلٹنے کا جذبہ، ذہنی مخلوق کا وہ بنیادی ناسٹالجیا ہے جس نے مذہب، فلسفہ اور سائنس کی آبیاری کی ہے۔ تصوف اسی جذبے کا گہوارہ ہے۔ جب یہی تصوف کسی ایک علاقے، ایک نسل یا ایک قوم کے لیے ادارے کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو مذہب بنتا ہے اور ادارہ ہونے کی حیثیت سے اس کے حدود متعین ہو جاتے ہیں اور تصوف کی بنیادی سیال نامیت گھٹ کر مذاہب کو جوئے کم آب بنا دیتی ہے لیکن معاشرتی ارتقا میں اس کی افادیت کا انکار ممکن نہیں- تاہم اس میں بھی شک نہیں کہ بعض حالات میں اس کے حدود کی سختی انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹ بھی بنی ہے۔ فلسفوں نے ہمیشہ حسی حدود سے تجاوز کر انسان میں پائی جانے والی تیسری جبلت کا امکان کھولا ہے لیکن ان کا ارضیت سے روگرداں ہو جانا انسانی ذہنی ارتقا کی راہ میں اکثر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔ ان کے مقابلے پر سائنس کی ارضیت پسندی کی شدت نے انھیں وہی نقصان پہنچایا جو فلسفوں کو ان کی ماوراپسندی کی شدت نے پہنچایا تھا۔

اقبال کا عہد فلسفہ اور سائنس کے انہیں منفی میلانات کے اثرات کا آئینہ دار تھا- اور آج تو صورت حال اور بھی ناگفتہ بہہ ہے- ایک طرف ارضیت سے روگردانی اور ماوراپسندی اور دوسری طرف سائنس کی ارضیت پسندی کی شدت نے اقبال کو ایک جدید تصوف کی داغ بیل ڈالنے یا قدیم تصوف کی عصری تعبیر کرنے پر مجبور کیا جس کے نتیجے میں انھوں نے ایک فلسفیانہ حکیمانہ نظام ''خودی'' کے عنوان سے پیش کیا- یہ وہ نظام معنی ہے جس سے حیات و کائنات کے تمام امکانی مسائل کی تشریح و تعبیر ہو سکے- یہ کام وہی کر سکتا تھا جو مذہب، فلسفہ، سائنس، کلچر اور تاریخ انسانی پر گہری نظر رکھتا ہو- اور اس میں شبہہ نہیں کہ اس معاملے میں اقبال نابغۂ عصر تھے- انھوں نے تہذیب کی بھی تنقید کی اور فلسفہ،

مذہب اور سائنس کو بھی ہدف تنقید بنایا- کیوں کہ وہ جس دانش کدے میں پروان چڑھے تھے، وہ آتش کدۂ نمرود بنا ہوا تھا:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

انہوں نے آتش نمرود کو گلزار بنانے کی کوشش کی کیوں کہ ان کے ہنر میں ایک تازہ جہاں آباد تھا۔ شرار نفس میں جہاں خورشید جہاں تاب کی ضو تھی وہیں خون جگر میں ایک جنت پنہاں تھی، جس کا مشاہدہ انھوں نے وجدانی بصیرت کے ذریعے کیا تھا اور چاہتے تھے کہ اس کی حقیقت نگاہ عام پر بھی جلوہ گر ہو۔ اس لیے انھوں نے بے معنی طومار کی قطع و برید شروع کر دی:

تصوف تکلم شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

انھوں نے حالات کی مقاومت کے لیے بیک وقت کئی محاذ قائم کیے۔ یہاں صرف تصوف پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔ اقبال کی نظر میں صوفی زندگی کا مفرور مجرم بن گیا تھا۔ خانقاہوں میں مجاور یا گورکن رہ گئے تھے۔ دل تاریک اور چہرہ روشن ہو رہا تھا۔ پیر کا گھر بجلی کے چراغوں سے منور ہو رہا تھا۔ بجلی کی ایجاد کرنے والا اور اس کی روشنی میں اپنی بصیرت سے محروم ہو جانے والا بھی زوال خودی کا مظہر تھا۔ مشرق اور مغرب کے حدود میں خط امتیاز بھی یہی تھا:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

یعنی ایک اندھا اور ایک کوڑھی اور یہ انسانی معاشرے کا ناسور بن چکا تھا۔ اقبال کی نظر پوری انسانیت اور پورے انسانی معاشرے پر تھی جو مشرق و مغرب کے اضافی حدود میں بٹا ہوا تھا۔ اقبال نے ایک ماہر نباض کی طرح انسانیت کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی اور انھوں نے ایک ماہر جراح کی طرح نشتر زنی شروع کر دی۔ اس سلسلے میں انھوں نے تصوف کی حقیقی روح کو بیدار کرنے کا بھی کارنامہ انجام دیا۔

تصوف چونکہ مذاہب کی روح ہے اس لیے وہ روح اسلام میں بھی روز اول ہی سے موجود تھی۔ ویسے بھی حضورؐ کی حیات طیبہ میں ہی اہل صفہ کی موجودگی صوفیانہ روایت کی نشاندہی کے لئے کافی

ہے۔علاوہ ازیں علم باطن کی تحصیل اوراس کے سیاسی، معاشرتی اورتہذیبی مؤثرات وافادیت کا اسلام کے دوراول میں ہی جو پتہ نشان ملتا ہے اسے کوئی ذی علم اور صاحب نظر جھٹلا نہیں سکتا۔اس سلسلے میں میکش اکبرآبادی کا ایک اقتباس ''نقد اقبال'' سے یہاں نقل کردیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

''جن صحابہ کوعلم باطن پہنچا ان میں ممتاز ترین شخصیت حضرت علی کرم اللہ وجہ کی ہے-آپ کی ذات اقدس بالاتفاق صوفیوں کی امام اول ہے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے تصوف کے منکر وہی ہیں جو حضرت کے مخالف ہیں چنانچہ سب سے پہلے تصوف کے منکر خارجی اور وہ مختلف فرقے ہیں، جو خارجی سے نکلے ہیں اور آج مختلف ناموں سے متعارف ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تصوف کو اپنے ابتدائی دور میں ہی ملوکیت اور جبر واستبداد سے ٹکر لینی پڑی اور یہ اتفاق تھا کی یہ ملوکیت بنی امیہ کی تھی جو حضرت علیؓ اوران کے خاندان کے قدیمی اور نسلی دشمن تھے۔اس لیے حکومت اوران کے طرفدار علماء صوفیوں کے مخالف رہے جب کہ حکومت کے ستائے ہوئے عوام صوفیوں کے ساتھ رہے۔ مخالفت کی وجوہ میں ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ اب بھی باقی ہے کہ جو اہل ظاہر اپنے آپ کو اسلام کا مکمل نمونہ اور کامل نمائندہ سمجھتے ہیں تصوف انہیں ناقص ثابت کرتا ہے، اوراس لیے خصوصیت سے یہ گروہ کشف وکرامات پر استدراج اور سیمیا وغیرہ کا الزام لگاتا ہے کیوں کہ وہ اس روحانی کمال سے عاجز ہے''۔

اقبال خصوصیت کے ساتھ روحانی کمال کے قائل ہیں اسی لیے وہ صوفیانہ تجربات کی قدر و قیمت اورافادیت واہمیت کے کبھی منکر نہیں رہے۔لیکن تصوف کو فلسفیانہ جواز دے کر ادارے کی صورت عطا کرنے والے پہلے شخص شیخ اکبر محی الدین ابن عربی تھے جو وجودی تفکر کے انتھک مفسر سمجھے جاتے ہیں۔ان کی تفسیر قرآن کو اقبال نے اہل ہنود کے ایک ایسے ہی نابغۂ عصر شری شنکر کی تفسیر گیتا کی نہج پر پایا۔اقبال کے خیال میں افلاطون بھی اسی منہاج فکر کا حامل تھا جس کی فکر نے اذہان عالم کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ یہ اقبال کے نزدیک کعبۂ دانش وبینش کے بڑے بڑے ہبل تھے جن کے فکری معنوی اثرات سے نفیِ خودی اور ذوق عمل سے محرومی کے میلان کو فروغ ہوا تھا۔ چنانچہ اقبال نے ان پر شدید

اور بعض اوقات جارحانہ وانتہا پسندانہ تنقیدیں کیں۔ اس میں اقبال کہاں تک حق بجانب تھے، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ یہاں ان کی تنقید کا پیمانہ ان کا تصور خودی تھا جو ''اسرار ورموز'' کی تخلیق واشاعت کے بعد بھی ارتقا پذیر رہا۔ چنانچہ اسرار خودی اور آخری دور کی تصنیف ''گلشن راز جدید'' میں خودی کا تصور ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پروفیسر یوسف حسین خاں کا یہ خیال غور طلب ہے کہ:

''اقبال کے خودی اور بے خودی کے تصور اور صوفیہ کے تصور میں بڑا فرق ہے۔ اقبال نے تصوف سے یہ اصطلاحیں مستعار لے کر انہیں بالکل دوسرے معنی پہنا دیے۔ کہیں کہیں اقبال روایتی تصوف سے بالکل قریب آجاتا ہے لیکن پھر ایک دم سے وہ چونک پڑتا ہے اور اپنے خاص مفہوم کو دوسرے انداز میں پیش کر دیتا ہے۔ روایتی تصوف سے اس کا اختلاف آخر تک قایم رہا۔ گو کہ آخری زمانے میں اس کے خیالات میں لچک پیدا ہوگئی تھی۔ چنانچہ اسرار خودی کے تصورات اور گلشن راز جدید کے خیالات میں بعض جگہ یہ فرق صاف نظر آتا ہے۔ بایں ہمہ اقبال نے عام طور پر خدا اور خودی کے تعلق میں خدا کی تنزیہی ماورائیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی، اس واسطے کہ بغیر اسے تسلیم کرنے کے اخلاقی عمل معنی خیز نہیں بنتا۔ چنانچہ ایک جگہ کہا ہے کہ انسانی خودی الگ رہ کر اس کی جدائی میں تڑپتی ہے۔ نہ ہم اس کے بغیر رہ سکتے ہیں اور نہ وہ ہمارے بغیر رہ سکتا ہے۔ جدائی اور مجبوری انسان کی بڑی دولت ہے جسے کبھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے:

ازو خود را بریدن فطرت ماست
تپیدن نارسیدن فطرت ماست
نہ او بے ما، نہ ما بے او چہ حالست
فراقِ ما فراق اندر وصالست
جدائی خاک را بخشد نگاہے
دہد سرمایۂ کوہے بہ کاہے
چہ خوش سودا کہ نالد از فراقش
و لیکن ہم ببالد از فراقش

(گلشن راز جدید)''۔

یعنی اقبال عام صوفیوں کے برعکس وصال پر فراق کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی خیال ''ذوق و شوق'' کے درج ذیل شعر سے بھی مترشح ہے:

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو ہجر میں لذتِ طلب

یہ اقبال کا رجائی نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے وہ ''لاتقنطوا'' میں ''رحمت اللہ'' دیکھتے ہیں۔ یہی انفرادیت پسندی ہے اور یہی وصال پر فراق کو ترجیح دینے کے لیے انھیں مجبور کرتی ہے۔ فکری طور پر یہی چیز ہے جو بہ ظاہر انھیں وحدۃ الوجود سے اختلاف کی طرف لے جاتی ہے لیکن وصال کے متمنی تمام صوفیا اور تمام شعراء ایسے نہیں ہیں جنھوں نے انفرادیت کا انکار کیا ہو۔ یہ بات غالب کی مثال سے بالکل واضح ہو جائے گی:

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

یعنی معمولی قطرہ ایک بڑی شناخت دریا میں مل جاتا ہے تو اس کی انفرادیت ختم نہیں ہوتی بلکہ اور نکھر جاتی ہے۔ وہ موج کی صورت میں ابھرتا ہے اور زیادہ قوی و مایہ دار دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح وصال میں بھی فراق کی حالت و کیفیت جستجو اور آرزو برقرار رہتی ہے اور وصال کی تمنا پروان چڑھتی رہتی ہے۔

اقبال شروع میں خدا کی مطلقیت کے ساتھ خودی کی انفرادیت کو جمع کرنے میں مشکل کے شکار ہوئے لیکن بالآخر خدا کی تنزیہی ماورائیت اور خودی کی انفرادیت کو مطلقیت یا کلیت کے سلسلے میں پرونے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن تصوف یا وحدۃ الوجود سے اختلاف کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی۔

مولانا روم زاویۂ وجدان کے رہبر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حلقۂ تصوف میں وہ وحدۃ الوجودی ہیں اور حافظ بھی وحدۃ الوجودی ہیں۔ لیکن اقبال وجدانی اہمیت کے پیش نظر رومی کو اپنا مرشد مان لیتے ہیں اور حافظ کی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آں فقیہِ ملت میخوارگاں

لیکن رومی اور حافظ میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ حافظ کی حال مستی عمل میں مانع آتی ہے جبکہ رومی کی جستجو محرک عمل بن جاتی ہے اور افلاطون انھیں حافظ ہی کی طرح ذوق عمل سے محروم دکھائی دیتا

ہے اس لیے اسے بھی ہدف تنقید بناتے ہیں:

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

ہنگامۂ موجود سے فرار وانکار اور ذوق عمل سے محرومی کو اقبال نفی خودی پر محمول کرتے ہیں۔ اس میلان کی مخالفت انھوں نے شدت کے ساتھ کی ہے۔

تصوف اور وحدۃ الوجود میں جہاں اقبال اثبات خودی کے میلان، ذوق عمل کی تحریک اور جدو جہد کی قوت کا مشاہدہ فرماتے ہیں، وہاں وہ حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور معاملہ برعکس ہوتو تنقید وتردید فرماتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے وجودی تفکر میں بعض اوقات تضاد نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین وشارحین نے انہیں وحدۃ الوجود کا قائل، بعض نے وحدۃ الوجود کا مخالف اور وحدۃ الشہود کا قائل اور بعض نے وحدۃ الوجوب کا قائل قرار دیا ہے۔ لیکن پروفیسر سلیم چشتی کا خیال ہے کہ ''ہمہ اوست''، ہمہ از وست'' اور ''باہمہ اوست'' یہ سبھی وحدۃ الوجود ہی کی مختلف شاخیں ہیں اور اقبال کے وحدۃ الوجودی تصور میں ان تینوں شاخوں کی فکریت کارفرما ہے۔ بہر حال وحدۃ الوجودی فلسفے کے بانی شیخ محی الدین ابن عربی اور وحدۃ الشہودی دبستان فکر کے مبلغ مجدالف ثانی شیخ احمد سرہندی مانے جاتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اقبال مجدد صاحب کے معتقد اور ابن عربی کے مخالف دکھائی دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ اختلاف رفتہ رفتہ کم ہوتے ہوتے ختم ہوجاتا ہے۔ حضرت محی الدین ابن عربی اور وحدۃ الوجود سے اقبال کے اختلاف پر روشنی ڈالتے ہوئے میکش اکبرآبادی رقمطراز ہیں:

''وحدۃ الوجود کی مخالفت اسرار خودی کے دیباچے سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد کی بعض تحریروں میں بھی یہ مخالفت ملتی ہے۔ مخالفت کے

موضوع پر علامہ کے ارشادات یہ ہیں: مسئلہ انا کی تحقیق و تدقیق میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نقطۂ خیال سے شری شنکر نے گیتا کی تفسیر کی اسی نقطۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور ان کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدۃ الوجود کو جس کے وہ انتھک مفسر تھے اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا---- اور ان کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر تمام اسلامی اقوام کو ذوق عمل سے محروم کر دیا''۔ (دیباچہ اسرار خودی تصنیف ۱۹۱۰ء)۔

''یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدۃ الوجود تھی۔ ان شعراء نے عجیب و غریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے''۔ (مکتوب اقبال ۱۹۱۶ء)

''جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم (محی الدین ابن عربی) میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ اور نہیں''۔ (مکتوب ۱۹۱۶ء)

''میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں''۔ (مکتوب ۱۹۱۷ء)

وحدۃ الوجود سے اقبال کے اختلاف کے حوالے کے بعد میکش اکبر آبادی نے تائید کے حوالے بھی بڑی دیانت داری کے ساتھ پیش کیے ہیں:

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

(پیام مشرق ۱۹۲۲ء)

قدیم و محدثِ ما از شمار است
شمارِ ما طلسم روزگار است

بہ خلوت ہم بہ جلوت نورِ ذات است
میانِ انجمن بودن حیات است

(زبورعجم ۱۹۲۷ء)

''یہ دنیا اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس شے کی میکانکی قوت سے لے کر جسے ہم مادے کا ایٹم کہتے ہیں انسانی انا کے تصور کی بالکل آزادانہ حرکت تک انائے عظیم کا خود کو ظاہر کرنا ہے''۔

''ایک انائے محیط کے نظریے سے کوئی غیر نہیں ہے اس میں تصور اور عمل جاننے کا عمل اور تخلیقی عمل سب ایک حیثیت رکھتے ہیں''۔

''دراصل مادی عالم کوئی ایسا ہیولی نہیں جو شروع سے خدا کے ساتھ ساتھ موجود ہو۔ اس کی ماہیت ایک عمل کی سی ہے جس کو فکر باہم دگر منفرد اشیا کی ایک کثرت میں تقسیم کر دیتی ہے''۔(خطبات اقبال ۱۹۲۹ء)

صوفیانہ تجربات کی قدر و قیمت اور اہمیت پر جس قدر عقلی اور منطقی پیرایے میں اقبال نے روشنی ڈالی ہے اس کے پیش نظر انھیں کوئی تصوف کا مخالف تسلیم نہیں کر سکتا۔ صوفیانہ مشاہدات کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے موصوف لکھتے ہیں:

''اس سلسلے میں پہلی قابل ذکر بات صوفیانہ مشاہدات کی حضوریت ہے، گو اس لحاظ سے بھی ان میں اور محسوسات و مدرکات کے دوسرے مراتب میں جو ہمارے لیے مدلولات علم کا سرچشمہ بنتے ہیں، فرق کرنا غلط ہوگا۔ اس لیے کہ مشاہدات تو سب ہی حضوری ہوتے ہیں۔ گویا جس طرح مدلولات حواس کے ذریعے ہم اپنے طبعی مشاہدات کے مختلف عوالم کی تعبیر کرتے ہیں تا کہ اس دنیا کا علم حاصل ہو سکے جو ہم سے خارج میں واقع ہے، بعینہ صوفیانہ

مشاہدات کا تعلق جس عالم سے ہے اس کی تعبیر سے ہمیں ذات الہیہ کا علم حاصل ہوتا ہے لہذا ان مشاہدات کو حضوری کہا جاتا ہے تو محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ ہمیں ذات باری تعالی کا ویسے ہی علم ہے جیسے کسی دوسری شے کا۔ وہ کوئی ریاضیاتی وجود ہے، نہ کوئی نظام معنی، جو باہم دیگر وابستہ تو ہوا کرتے ہیں لیکن جو تجربے اور مشاہدے میں کبھی نہیں آتے''۔

تصوف کی اہمیت واضح کرتے ہوئے دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''بلاشبہہ تصوف نے انا کے لیے نئے باب کھولے ہیں اور اس کو اپنے تجربے کا خاص موضوع بنایا ہے۔ اس کا ادب روشنی پیدا کرنے والا ہے لیکن اس کی مخصوص اصطلاحات جو کہ فرسودہ مابعد الطبیعات نے تشکیل کی ہیں ایک نئے دماغ پر موت کا سا اثر ڈالتے ہیں۔ ایک نامعلوم شے کی تلاش جیسا کہ نو فلاطونی تصوف میں ظاہر کیا گیا ہے، چاہے وہ عیسائی ہو یا اسلامی ایک نئے دماغ کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ نئے دماغ کی عادت یہ ہے کہ وہ محسوس چیزوں کو سوچتا ہے اور خدا کا ایک زندہ اور محسوس تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہے''۔

اس طرح تصوف اور وحدۃ الوجود کے سلسلے میں اقبال کے خیالات متضاد معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ دیکھنا یہ ہوگا کہ (۱) کیا وحدۃ الوجود میں شری شنکر اور ابن عربی متحد الخیال ہیں۔ (۲) کیا وحدۃ الوجود کا عقیدہ نفئی خودی کا مؤید ہے اور ارباب وحدۃ الوجود کا منتہائے مقصود حیات کلی یا خدا میں فنا ہوجانا ہے۔ (۳) کیا وحدۃ الوجود ترک عمل کا حامی ہے۔ (۴) کیا بدھ مت کی فنا اور صوفیوں کی فنا ایک ہے یا مختلف۔

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو (۱) وحدۃ الوجود میں شری شنکر اور ابن عربی متحد الخیال نہیں ہیں (۲) وحدۃ الوجود کا عقیدہ نفیِ خودی کا مؤید نہیں ہے اور نہ ارباب وحدہ الوجود کا منتہائے مقصود حیات کلی یا خدا میں فنا ہوجانا ہے۔ (۳) وحدہ الوجود ترک عمل کا حامی نہیں ہے۔ (۴) بدھ کی فنا اور صوفیوں کی فنا میں بہت فرق ہے۔

اب جہاں تک صوفیانہ لٹریچر میں استعمال ہونے والی مخصوص اصطلاحات کا تعلق ہے جو کہ

بقول اقبال فرسودہ مابعدالطبیعات نے تشکیل کی ہیں اور جو ایک نئے دماغ پر موت کا سا اثر ڈالتی ہیں، تو یہ ایک الگ مسئلہ ہے اور اس میں زمانی فصل وبُعد کو خاصہ دخل ہے۔ جس زمانے میں اصطلاحات وضع کی گئیں وہ اقتضائے حالات کے مطابق تھیں۔ اگر مدت طویل کے بعد یا زمانۂ حال میں وہ فرسودہ دکھائی دیتی ہیں تو یہ غیر فطری نہیں۔ اقبال نے قدیم متن کی عصری تعبیر کرتے ہوئے جو اصطلاحات استعمال کی ہیں وہ فلسفہ جدید کے طلبہ کے لیے مخصوص ہیں لیکن موجودہ معیار کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ طلبہ کیا علماء کے لیے بھی ان کی حیثیت لوہے کے چنے کی سی ہے۔ بہر حال عرض یہ کرنا ہے کہ اقبال کو وحدۃ الوجود اور تصوف کے سلسلہ میں غلط فہمیوں میں مبتلا کرنے والی چیز وہ اصطلاحات ہیں جنہیں وہ فرسودہ کہتے ہیں۔ یا پھر تصوف کے نقلی پیرایے اور جہاں تک اس میں غیر اسلامی عنصر کی شمولیت کا سوال ہے تو اسلام اور غیر اسلام اقبال کے لفظیاتی نظام میں خود تشریح طلب ہیں۔ یعنی اسلام سے ان کی کیا مراد ہے اور غیر اسلام سے وہ کیا سمجھتے ہیں؟ یہ سوال اس لئے بھی ضروری ہے کہ اگر غیر اسلام یا غیر اسلامی خصوصیات سے پرخاش ہوتی تو اقبال شری کرشن اور شری رام انوج کی قصیدہ خوانی نہ کرتے۔

اقبال نے بعض اوقات اپنے مقاصد کی تکمیل وترسیل کے لیے اسلامی اصطلاحات کو بھی بدل دینے میں عافیت محسوس کی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں مغربیوں کو اگر اسلام سے کد ہے تو اسی کا دوسرا نام ''فقر غیور'' ہے۔ اسی طرح اقبال نے کفر واسلام کی تشریح رائج اصطلاحی معنی سے ہٹ کر کی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں:

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

اگر اقبال کے معنیاتی نظام پر نظر ڈالی جائے تو عشق ہی حرکت وعمل ہے اور یہی اسلام یا مسلمانی ہے۔ اور اس کے برعکس جمود وتعطل کفر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ عشق ذوق عمل اور عین اسلام ہے اور ذوق عمل سے محرومی کفر ہے۔

افلاطون پر اقبال کا اعتراض یہ بھی ہے کہ اس نے کائنات کو یا ہنگامہ موجود کو غیر حقیقی سمجھا چنانچہ اس سے منھ موڑ کر وارفتہ معدوم ہو گیا اور یہی ذوق عمل سے محرومی کا باعث بنا۔ اسی کو اقبال نے مغضب روحانیت یا افیونی خواص کی حامل روحانیت تصور کیا ہے اور ایسی روحانیت کی تردید اور مذمت کی ہے۔

اقبال کا مذہب خودی ہے۔ان کا مسلک جدوجہد اوران کا مشرب حرکت وعمل ہے۔ان کی ملاقات اپنے زمانے کے صوفیوں سے بھی رہی اوران کا تعلق خانقاہوں سے بھی رہا۔انھوں نے جہاں تصوف کی حقیقت کو سمجھا وہیں اس کے نقلی پیرایوں کا بھی پردہ فاش کیا۔اس طرح انھوں نے بظاہر تصوف اور خانقاہ کے خلاف محاذ آرائی کی لیکن در پردہ ان کی بنیادی روح فراہم کردی ۔ ڈاکٹر ایم۔اے۔رضوی کے مطابق:

''اسلام میں چونکہ نظر کا پودا آزاد فضا میں نشو ونما نہیں پاسکا تھا کیوں کہ رسولؐ کے بعد ہی اسلام ایک طرح کی فقہی شدت پسندی کا شکار ہو چکا تھا اور اہل عرب اچھے جنگ جو تھے اس لئے انھیں سخت جنگی نظام راس آتا تھا، اس لئے بھی ان میں تفکر کی صحیح نشو ونما نہیں ہوسکی اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اسلامی تفکر اور فلسفہ فطری اور بنیادی طور پر بنی ہاشم کا حصہ تھا۔اس لیے اس بات کی کوشش کی گئی کہ بنی ہاشم کا تعلق عوام سے جہاں تک ممکن ہو کاٹ کر رکھا جائے۔انصار مدینہ جو انھیں کی طرح سیاسی دائرے کی اہمیت سے نکالے گئے تھے، سیاست سے دست کش ہو کر تعقل اور تفکر کی طرح مائل ہو رہے تھے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے اموی، عباسی اور آل مروان کی سیاسی بالادستی نے اسلام کے مفکرین اور صوفیا پر زندگی سخت کر رکھی تھی۔انھیں ذہنی میلانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن رشد جیسا حکیم راتوں رات اپنی ساری لائبریری کو اونٹوں پر باندھ کر یہودی کی پناہ میں چلا گیا اور اسلام ایک عصر ساز مفکر سے محروم ہو گیا، تو ادیس قرنی سا بالغ نظر صوفی شہر چھوڑ کر دشت وصحرا کی تنہائیوں میں کھو گیا اور گویا وہیں سے صوفیا اور فقہا کے دو الگ الگ زاویے اسلام میں قائم ہوئے کیوں کہ فقہا کو دربار کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے اکثر صوفیا کو ہجرت، گوشہ گیری اور مصائب سے دوچار رہنا پڑا اور زیادہ تر صوفیا قتل کر دیے گئے۔ ایسے لوگوں میں دو واقعات بہت اہم ہیں۔منصور حلاّج کا سولی پانا اور ہند میں سرمد کی شہادت''۔

تصوف بالخصوص وحدۃ الوجود کی مایہ داری اوراس کی سماجی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے میکش اکبرآبادی لکھتے ہیں:

''اسلام کے قرون اولی میں یہ ان لوگوں کا نظریہ رہا ہے جو شخصی سلطنت، سرمایہ داری اور جبر واستبداد کے خلاف تھے۔اسی لیے عوام ان کے ساتھ رہے۔کیوں کہ وحدۃ الوجود انسان کوانسان کے سامنے پست ہونے سے روکتا ہےاوراونچ نیچ کے خلاف ایک موثر حربہ ہے۔صوفیا کے سرگروہ خواجہ حسن بصری اورائمۂ اہل بیت کی زندگی اورسیرت کے مطالعے سے اس بات کی تائید ہوسکتی ہے۔بہرحال آج بھی اگرکسی نظریے کی بنا پرتمام دنیا کے انسان ایک برادری بن سکتے ہیں تو وہ یہی نظریہ ہے۔اس میں شک نہیں کہ طبقاتی برتری کے حامیوں نے اس نظریے کوبھی اپنا آلۂ کار بنانا چاہا ہےاوراس میں ترمیمیں کی ہیں جوان کے لئے مفید ہوں''۔

انسانی خودی کے تحفظ پر اسلام نے جوزور دیا ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔صوفیوں کے نزدیک بقاباللہ کے معنی ہی دراصل تحقیق خودی کے ہیں۔اورخودی کا سارافلسفہ'من عرف نفسہ فقدعرف ربہ'' میں جمع ہے،حضرت علی اپنے اشعار کے ذریعے انسان کومخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ''تو اپنے آپ کوایک حقیر ہستی سمجھتا ہے حالانکہ تجھ میں سب سے بڑا عالم پوشیدہ ہےتو ہی وہ کتاب مبین ہے جس کے حروف سے اسرار ظاہر ہوتے ہیں۔تو ہی عین وجود ہےاور جو کچھ تجھ میں ہے اس کا حصر نہیں کیا جاسکتا ہے''۔

سچ تو یہ ہے کہ تصوف کے جتنے بھی سلسلے ہیں سبھوں کی نسبت حضرت علی سے ہی ہے۔میکش اکبرآبادی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''صوفیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ طریقہ مخصوص صحابہ خصوصاً حضرت علی کوحضور صلعم سے پہنچا ہے۔شاہ ولی اللہ محدث نے القول الجمیل میں کہا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نسبت رسول صل اللہ علیہ وسلم سے ہمارے مشائخ کے ذریعے پہنچی ہے۔البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقے

اور رنگ مختلف ہیں۔قول الجمیل کے فوائد میں شاہ عبدالعزیز صاحب نے صحیح مسلم کی ایک حدیث بھی بیان کی ہے جس میں حضور نے حضرت علیؓ کو خدا کی طرف توجہ کرنے کا ایک طریقہ تعلیم فرمایا تھا''۔

قرآن سے ثابت ہے کہ کچھ اسرار ورموز ایسے ہیں جنھیں خدا اپنے خاص بندوں کو تعلیم فرماتا ہے۔ یہی طریقہ انبیائے کرام کا بھی رہا کہ انھوں نے اپنے خاص صحابہ کو استعداد کا لحاظ رکھتے ہوئے خاص تعلیم دی۔فرق ہی کی مناسبت سے اولیا، شہدا، صالحین، سابقین وغیرہ کے درجات قرآن نے مقرر کیے۔ بہر حال مذہب اسلام کی طرح تصوف اسلام میں بھی توحید ہی اصل اصول ہے، باقی تمام ارکان وعبادات فرع اور وسیلہ ہیں۔

تصوف بالخصوص وحدۃ الوجود سند متصل سے پیغمبر اسلام سے اہل باطن کو پہنچا ہے اور اس عقیدے کی رو سے عالم معدوم یا فریب نظر نہیں ہے۔ عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہے-۔قرآن سے اس کی تائید ہو جاتی ہے کہ موجودات خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں، زمانی ہوں یا مکانی سب کی حقیقت اللہ ہی ہے۔ اللہ کے سوا نہ معبود ہے نہ موجود ہے نہ مقصود ہے۔یعنی اللہ ہی اول وآخر اور باطن وظاہر ہے-اقبال کے خیال میں یہ انائے محیط ہے اور اس کے باہر کوئی چیز فرض نہیں جا سکتی۔

اب اللہ کے سوا سب کچھ عدم محض ہے تو زمین وآسمان کیا ہیں اور یہ عالم باطل ہے یا عین حق! تو قرآن کا جواب ہے، زمین وآسمان کی تخلیق وظہور حق سے ہے لیکن یہ معرفت رہنمائے علم ہی نہیں بلکہ عمل اور مجاہدے سے حاصل ہو سکتی ہے، اس لیے اللہ فرماتا ہے، ہمارے لیے جو جد و جہد اور کوشش کرتے ہیں ہم اپنا راستہ انھیں دکھلائیں گے۔اس لیے فکر کے ساتھ ساتھ ذکر بھی ضروری ہے اس طرح کہ ایک لمحہ بھی غفلت میں نہ گزرے۔ یہ اسلامی اور غیر اسلامی تصوف کا ایک اصولی فرق ہے۔ دل جب دنیا کے علائق سے منھ موڑ کر اللہ کی طرف توجہ کرتا ہے تو مشاہدے کی منزل آتی ہے۔ جب انسان، آفاق (خارجی عالم) اور 'انفس' (اپنی ذات) میں خدا کا مشاہدہ کرتا ہے، اس وقت انسان کو صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے۔اس طرح انسان کی ذات اور خارجی کائنات حق ہے- خدا انسان کی شہہ رگ سے بھی قریب ہے۔اسی کا عرفان صوفیوں کا مطمح نظر ہے۔

صوفیوں نے اور اقبال نے بھی از روئے قرآن ذات یا حقیقت مطلق کو نور سے تعبیر کیا

ہے۔اس سے ظہور یا وجود مراد ہے۔اقبال نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:''نور یا روشنی کے استعارے سے ذات باری کا ہر چیز میں نفوذ مراد نہیں بلکہ اس کی مطلقیت کو اجاگر کرنا مقصود ہے''۔اور وصال سے مراد یہ ہے کہ انسان نور مطلق کو خود میں جذب کر کے اپنی خودی کو مستحکم کر لے۔

ابن عربی اور دوسرے صوفیا بھی وجود سے حقیقت ہی مراد لیتے ہیں-صوفیوں کا مذہب یہ ہے کہ واجب تعالی ہی موجود مطلق ہے۔وجود ہی واجب ہے اور تعین اس کی صفت ہے جو اسے عارض ہے۔

اقبال نے خدا کو فرد تسلیم کیا ہے۔اس کا جواز انھیں اسلامی لٹریچر میں مل گیا تھا۔اس کے لیے انھیں تنزلات کے نظریے سے استفادہ کرنا پڑا۔انھوں نے تنزلات کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ تنزلات کے مسئلے کو انھوں نے بڑی باریکی سے حل کیا۔ورنہ فردیت کا تصور دوسرے مذاہب میں آخر کار تشبیہ وتجسیم میں بدل جاتا ہے اور اسلام میں بھی اس کی مثال ملتی ہے۔بہر حال مطلقیت کے ساتھ فردیت کے تصور کو جمع کر کے اقبال حلول واتحاد کے الزام سے بھی بری ہو جاتے ہیں۔ان کے نزدیک حلول واتحاد محال اور خودی وخدا ایک ہی ہے:

خودی اندر خودی گنجد محال است
خودی را عینِ حق بودن کمال است

یہ خودی وہم نہیں بلکہ حق ہے۔اس کا فرمان خدا کا فرمان ہے اور خدا کا فرمان اس صورت میں حاصل ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی خودی میں ڈوب کر اپنا فرمان حاصل کرے۔کیوں کہ خودی عین خدا ہے۔اس لیے یہ کہیں کہ سوائے خدا کے سب معدوم ہے یا یوں کہیں کہ سوائے خودی سب معدوم ہے، بات برابر ہی ہے۔میکش اکبر آبادی کے مطابق:

> ''صوفیائے اسلام کا سب سے بڑا گروہ جس میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی بھی شامل ہیں، عالم کو معدوم یا فریب نظر نہیں مانتا بلکہ ان کے خیال میں عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن سے اسی نظریے کی تائید ہوتی ہے-قرآن نے وضاحت سے کہا ہے کہ موجودات خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں، زمانی ہوں یا مکانی، سب کی حقیقت اللہ ہی ہے''-

اور اقبال فرماتے ہیں:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

حقیقت جب اضافت اور نسبت کی وجہ سے متعین ہوتی ہے اور اس صورت میں جب اس کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے تو اسے ''انا'' یا من کہتے ہیں۔ یعنی مطلق جب متعین ہوتا ہے یا وحدت جب کثرت میں ظاہر ہوتی ہے اور کل افراد کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس متعین کو انا اور خودی کہا جاتا ہے:

چو ہستِ مطلق آید در اشارت
بہ لفظِ ''من'' کند ازوے عبارت
حقیقت کز تعین شد معین
تو او را در عبارت گفتۂ ''من''

من و تو عارضِ ذاتِ وجودیم
مشکہائے مشکوۃ وجودیم
ہمہ یک نور داں اشباح و ارواح
گہ از آئینہ پیدا گہہ ز مصباح
تو گوئی لفظ من در ہر عبارت
بسوئے روح می باشد بشارت
چو کردی پیشوائے خود خرد را
نمی دانی ز جزو خویش خودرا
من و تو برتر از جان و تن آمد
کہ ایں ہر دو ز اجزائے من آمد
بہ لفظِ من نہ انسانست مخصوص
کہ تا گوئی بداں جانست مخصوص

(گلشن راز جدید)

اقبال نے مثال میں وہی الفاظ استعمال کیے ہیں جو قرآن نے اس آیت میں کیے ہیں۔ ''اللہ نورالسموات والارض مثل نور کمشکوۃ فیھا مصباح''---مراد یہ ہے کہ نور ایک ہی ہے جو قندیل یا مشکوۃ کے سوراخوں میں سے نکل کر مختلف شکلیں اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح نور کی ہر شکل ایک انا کہلاتی ہے۔ مادہ ہو یا صورت، مثال ہو یا روح سب ایک ہی نور کی شکلیں ہیں۔اس کی تفسیر یا تعبیر میں صوفیا نے کہا ہے کہ نور سے مراد ظہور ہے اور ظہور سے مطلب وجود ہے۔یعنی اللہ ہی آسمانوں اور زمینوں کا وجود اور حقیقت ہے۔

غرض یہ کہ خودی سے مراد وہ حقیقت مطلقہ ہے جو کسی خاص تعین میں ظاہر ہو کر قابل اشارہ ہوگئی ہے اور جس طرح روح اس حقیقت مطلقہ کی ایک تجلی ہے اسی طرح مادہ بھی اس کا ایک خاص مظہر ہے:

من و تو بر تر از جان و تن آمد
کہ ایں ہر دو ز اجزائے من آمد

اقبال بھی مادہ اور روح کو دو مختلف حقیقتیں نہیں مانتے ہیں، ان کے نظام فکر میں روح اور مادے کا انضمام تخلیقی تصور کے تحت پایا جاتا ہے۔مختصر یہ کہ خودی کو اس خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے میں اقبال کی جس نظریے نے مدد کی وہ تصوف ہے اور تصوف میں بھی بقول میکش اکبرآبادی وحدۃ الوجود کا نظریہ ہے جس کے اقبال کبھی مخالف بھی رہے۔

اسی مثبت تصوف اور وحدۃ الوجود سے اقبال نے مادے اور روح کی وحدت کا اصول قائم کیا، اثبات خودی اور خدا و خودی کی وحدت کا عقیدہ حاصل کیا۔ترک عالم اور مادے سے فرار و نفرت کو غلط ثابت کر سکے اور اس قابل ہو سکے کہ جدید ترقی یافتہ نظریوں کے مقابلے میں اپنا نظریہ پیش کر سکیں۔اس طرح انہوں نے روایتی تصوف یا تصوف کے نقلی پیرایوں کی تنقید کر کے اس کی بنیادی روح فراہم کر دی۔

☆☆☆

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

وارث علوی: رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں رہا

پروفیسر وارث علوی نے 9 جنوری 2014 کی شام عدم کے کُوچ کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔اُردو ادب کا وہ آفتاب جو 1928 میں احمد آباد (بھارت) سے طلوع ہوا وہ عدم کی بے کراں وادیوں میں غروب ہو گیا۔اُردو تنقید، تحقیق، تخلیقِ ادب اور تدریس ادب کے ہمالہ کی ایک سر بہ فلک چوٹی فرشتہء اجل کے ہاتھوں زمیں بوس ہوگئی۔احمد آباد کے شہرِ خموشاں کی زمین نے اُردو ادب کے اِس خورشید جہاں تاب کو ہمیشہ کے لیے اپنے دامن میں چُھپا لیا۔اِس شہرِ خموشاں کی زمین نے اُردو زبان و ادب کے اُس آسمان کو نِگل لیا جو گزشتہ سات عشروں سے علم و ادب سے وابستہ افراد کے سر پر سایہ فِگن تھا۔اُردو ادب کی کوئی بھی صنف ہو، عالمی ادبیات کی کوئی بھی جہت ہو، تنقید و تحقیق کا کوئی بھی زاویہ ہو اور معیار ادب کا کوئی بھی اسلوب ہو ہر جگہ اس لافانی ادیب کے افکار کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ تفہیم ادب کا کوئی بھی عکس ہو اُسی کے خدوخال دل و نگاہ کو مسخر کر لیتے ہیں۔حریت فکر کے اِس مجاہد کے افکار کی ضیا پاشیوں سے اکنافِ عالم کا گوشہ گوشہ بُقعہء نور بن گیا۔وارث علوی ایک دبستان علم و ادب کا نام ہے، وہ اردو ادب کے ایک درخشاں عہد کی نشانی تھے۔ان کی وفات سے اردو ادب اور اردو تنقید کا ایک زریں عہد اپنے اختتام کو پہنچا۔دنیا لاکھ ترقی کے مدارج طے کرتی چلی جائے ایسی نابغہء روزگار ہستیاں اور یگانہء روزگار فاضل کبھی پیدا نہیں ہو سکتے۔وہ اردو اور گجراتی زبان کے ادب کا ایک دائرۃ المعارف تھے۔جب تک دنیا باقی ہے قارئینِ ادب اس دبستانِ علم و ادب سے استفادہ کرتے رہیں گے اور ان کے خیالات سے اذہان کی تطہیر و تنویر کا اہتمام ہوتا رہے گا ۔وارث علوی نے اُردو تنقید کو معیار اور وقار کی رفعت سے آشنا کیا اور اُردو ادب کو عالمی ادبیات میں معزز و مفتخر کر دیا۔اس عظیم ادیب کی علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی خدمات اور بصیرت افروز خیالات کی اہمیت و افادیت کا ایک عالم معترف ہے۔تاریخ ہر دور میں اس باکمال ادیب کی فقید المثال خدمات کا اعتراف کرے گی اور ہر دور

کا مورخ ان کے نام کی تعظیم کرے گا۔آنے والی نسلیں اس با کمال تخلیق کار کے ابد آشنا اسلوب کی تقلید کر کے اپنی تخلیقی سمت درست کریں گی۔اردو زبان اور گجراتی زبان کے ادب کی ثروت میں وارث علوی نے اپنی تخلیقی فعالیت سے جو اضافہ کیا تاریخِ ادب میں وہ آبِ زر سے لکھا جائے گا۔مجروح سلطان پوری نے سچ کہا تھا:

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

وارث علوی کا پورا نام وارث حسین علوی تھا۔وہ اپنے قلمی نام وارث علوی کے نام سے مشہور ہوئے۔وارث علوی کا تعلق احمد آباد کے ایک ممتاز دینی،علمی اور ادبی خاندان سے تھا۔ان کے خاندان کو پورے علاقے میں عزت واحترام کا لائق صد رشک مقام حاصل تھا۔گجرات کے ممتاز عالم دین اور صوفی بزرگ حضرت شاہ وجیہہ الدین علوی ان کے خاندان کی نامور ہستی تھے۔وارث علوی کے والد سید حسینی پیر علوی اور والدہ محترمہ حفیظ النسا نے اپنے اس ہونہار بچے کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دی۔انجمن اسلامیہ ہائی سکول احمد آباد سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبر حاصل کر کے پاس کرنے کے بعد وارث علوی نے اعلا تعلیم کے لیے ممبئی جانے کا فیصلہ کیا اور ممبئی یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لی۔ممبئی یونیورسٹی کے بی۔اے کے امتحان میں وہ اول آئے اور انھیں طلائی تمغہ مِلا۔اس کے بعد انھوں نے گجرات یونیورسٹی سے اردو زبان وادب میں ایم۔اے کیا۔ سر سید احمد خان اور ان کے عظیم رفقائے کار کی علمی،ادبی اور قومی خدمات کے وہ معترف تھے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انھیں قلبی لگاؤ تھا۔اس عظیم اور تاریخی جامعہ سے انھوں نے انگریزی زبان میں ایم۔اے کیا۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد وارث علوی شعبہ تدریس سے وابستہ ہو گئے اور 1955 میں سینٹ زیویرس کالج (St.Xavier's College) احمد آباد میں انھیں تدریس انگریزی پر مامور کیا گیا۔انھوں نے اس ادارے میں مسلسل تینتیس (33) برس تک تدریسی خدمات انجام دیں۔وہ اس کالج کی ڈرامیٹک کلب کی روحِ رواں تھے جس کے زیر اہتمام ان کے متعدد ڈرامے سٹیج کیے گئے۔ان ڈراموں کو زبردست پذیرائی ملی۔یہ ڈرامے گزشتہ صدی کے ساٹھ کے عشرے میں سٹیج پر پیش کیے گئے۔اس کے علاوہ ان کے گجراتی زبان میں لکھے گئے ڈراموں کو گجرات،احمد آباد اور ممبئی میں بھی سٹیج کیا گیا۔وارث علوی نے اس کالج میں نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں کو فروغ دیا اور شاہین بچوں کو بلند پروازی نصیب

ہوئی۔خاک کو اکسیر بنانے اور غبار راہ سے نگاہوں کو خیرہ کرنے والے جلوے پیش کرنے والے اس دانش ور نے اپنی موثر تدریس سے نئی نسل کو عصری آگہی سے متمتع کر کے ان کی سیرت اور کردار کی تعمیر میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔وہ ہر دل عزیز استاد تھے اور ان کے شاگردان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اسی تعلیمی ادارے سے 1988 میں وہ ریٹائر ہوئے۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے وقت وہ شعبہ انگریزی کی صدارت کے منصب جلیلہ پر فائز تھے۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف میں گزرتا تھا۔ ان کی تنقید کو قارئین ادب نے بہت پسند کیا۔ وارث علوی ایک کثیر التصانیف ادیب تھے۔ان کی معرکہ آرا تصانیف درج ذیل ہیں:

(1) تیسرے درجے کا مسافر 1981
(2) اے پیارے لوگو (1981)
(3) حالی مقدمہ اور ہم (1983)
(4) خندہ ہائے بے جا (1987)
(5) راجندر سنگھ بیدی۔مونوگراف۔(1989)
(6) کچھ بچا لایا ہوں (1990)
(7) پیشہ تو سپہ گری ہے (1990)
(8) جدید افسانہ اور اس کے مسائل (1990)
(9) فکشن کی تنقید کا المیہ (1992)
(10) سعادت حسن منٹو۔مونوگراف۔(1995)
(11) سعادت حسن منٹو: ایک مطالعہ (1997)
(12) اوراقِ پارینہ (1998)
(13) بورژوا ژی بورژوا ژی (1999)
(14) منتخب مضامین (2000)
(15) ادب کا غیر اہم آدمی (2001)
(16) لکھتے رقعہ لکھے گئے دفتر (2001)
(17) ناخن کا قرض (2003)

(18)سرزنشِ خار (2005)

(19)کلیات راجندر سنگھ بیدی جلداول،جلد دوم(2005)

(20)راجندر سنگھ بیدی:ایک مطالعہ (2006)

(21)گنجینہ خیال (2007)

(22)بت خانہ حسن (2010)

وارث علوی کی کئی اہم تصانیف پاکستان سے بھی شائع ہوئیں۔ان کی یہ تصانیف پاکستان کی کئی بڑی جامعات کے نصاب میں شامل ہیں۔ڈاکٹر نثار احمد قریشی،ڈاکٹر بشیر سیفی،ڈاکٹر صابر کلوروی، ڈاکٹر صابر آفاقی،پروفیسر غفار بابر پروفیسر شبیر احمد اختر،ارشد علی خان،خادم مگھیانوی،سید مظفر علی ظفر، الحاج سید غلام بھیک نیرنگ،عاشق حسین فائق،محمد شیر افضل جعفری،کبیر انور جعفری،سید جعفر طاہر،راجا رسالو،سبط الحسن ضیغم،رام ریاض،معین تابش،محمد منشا یاد،میاں اقبال زخمی،سید اختر حسین اختر، محمد حیات خان سیال،محمد آصف خان،صاحب زادہ رفعت سلطان،ارشاد گرامی،محسن بھوپالی،پروفیسر عتیق احمد،مہر بشارت خان،سمیع اللہ قریشی،دیوان الیاس نصیب،نور احمد ثاقب اور سجاد بخاری ان کے تنقیدی اسلوب کے بہت بڑے مداح تھے۔ان مشاہیر کے ساتھ معتبر ربط کا یہ سلسلہ زندگی بھر برقرار رہا۔پاکستانی ادیبوں کو وہ اپنی تصانیف بھی ارسال کرتے اوران کی بے لاگ رائے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔وارث علوی کے اسلوب میں موضوعات کا جو تنوع ہے وہ ان کی انفردیت کی دلیل ہے۔انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا تنقید اور تحقیق کا حق ادا کر دیا۔میر تقی میر،مرزا اسداللہ خان غالب،علامہ اقبال،جوش ملیح آبادی،فراق گورکھپوری،فیض احمد فیض،سعادت حسن منٹو،اور راجندر سنگھ بیدی پر ان کے فکر پرور،خیال افروز اور بصیرت سے لبریز تجزیات قاری کے فکر ونظر کو مہمیز کرنے کا وسیلہ ہیں۔وارث علوی کی ایک اہم کتاب ''راجندر سنگھ بیدی:ایک مطالعہ'' بلا شبہ اعلا تنقیدی معیار سامنے لاتی ہے چار سو ساٹھ پر مشتمل یہ کتاب جسے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے شائع کیا ہے اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتی ہے یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے میں دو مضمون کلیدی اہمیت کے حامل ہیں۔پہلا مضمون ''بیدی کی فن کارانہ شخصیت'' اور دوسرا مضمون ''بیدی کے افسانوں کی زبان'' ہے۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ عملی تنقید پر مشتمل ہے۔اردو میں فن افسانہ نگاری کی تفہیم کے موضوع پر اس کتاب کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔اس کتاب میں مصنف نے منتخب افسانوں کو مختلف عنوانات

کے تحت شامل کیا ہے۔اس کے مطالعہ سے قارئین ادب کو راجندر سنگھ بیدی کے اسلوب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔اس حصے میں راجندر سنگھ بیدی کے باسٹھ افسانوں پر وارث علوی کے مختصر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔وارث علوی نے اس کتاب میں راجندر سنگھ بیدی کے اٹھاون افسانوں کا عالمانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ایک صاحب طرز ادیب اور منفرد اسلوب کے حامل نقاد کی حیثیت سے وارث علوی ے ادبی اقدار کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ادبی تخلیقات کے معیار کے سلسلے میں وہ کسی نرمی ،مصلحت کے قائل نہ تھے۔ اردو میں افسانے کی تنقید کے سلسلے میں یہ تجزیاتی مطالعہ پڑھ کر قارئین ادب کو پروفیسر سید وقار عظیم کا اسلوب یاد آ جاتا ہے جنھیں اردو میں افسانے کی تنقید کے حوالے سے اہم مقام حاصل ہے۔

راجندر سنگھ بیدی (مونوگراف) بھی وارث علوی کی بہت اہم تصنیف ہے۔ساہتیہ اکادمی کی مالی اعانت سے شائع ہونے والی یہ کتاب ہندستانی ادب کے معمار کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔عملی تنقید میں انھوں نے مشرقی اور مغربی تنقیدی دبستانوں کے اسالیب پر نظر رکھی ہے۔ان کے تنقیدی مقالات کے مجموعے ''تیسرے درجے کا مسافر'' اور ''اے پیارے لوگو'' قارئین ادب میں بہت مقبول ہوئے۔ ان مقالات میں وارث علوی نے علمی ،ادبی سماجی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں اپنا موقف بلا کم و کاست پیش کیا ہے۔ان کی تصنیف خندہ ہائے بے جا کچھ ادیبوں کے اسلوب اور کچھ اہم تصانیف کے بارے میں ہے۔ وارث علوی نے قلم اور قرطاس کے ساتھ جو عہدِ وفا استوار کیا اسے علاج گردشِ لیل و نہار سمجھتے ہوئے زندگی بھر اس پر عمل پیرا رہے۔وہ آخری وقت تک پرورشِ لوح و قلم میں مصروف رہے۔ادبی تنقید ان کا خاص شعبہ تھا۔تنقید سے ان کی دلچسپی ان کی حق گوئی اور بے باکی کا عملی نمونہ تھی۔ تنقید جیسے مشکل اور خشک مضمون کو انھوں نے اپنی گل افشانیء گفتار سے ہر دل عزیز بنا دیا۔ان کی حاضر دماغی ،شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی نے ان کی شخصیت کو مضبوطی اور استحکام سے متمتع کر دیا۔بات سے پیدا کرنا ان کے اسلوب کا امتیازی وصف سمجھا جاتا ہے۔ان کی شگفتہ مزاجی اور راست گوئی کے امتزاج سے ان کی تحریر میں ایک ایسی جاذبیت اور دل کشی ظاہر ہوتی تھی جو قاری کو مسحور کر دیتی تھی۔ہر ملاقاتی کے ساتھ اخلاق اور اخلاص سے لبریز سلوک کرنا ان کا شیوہ تھا۔وہ بولتے تو ان کی باتوں سے پھول جھڑتے اور جب تنقید لکھتے تو یہی پھول اپنے ساتھ کئی خار بھی لیے ہوتے تھے۔یہ خار تخلیقی عمل میں در آنے والے مفسد مواد کی جراحت کے لیے اکسیر تھے۔اسی کے اعجاز سے ان کی تنقید کو ایک نیا آہنگ اور اچھوتا رجحان نصیب ہوا۔دہلی اور لکھنو جیسے بڑے ادبی مراکز سے دور ہونے کے باوجود وارث علوی

نے اپنے تخلیقی کام کی پوری دنیا میں دھاک بٹھادی۔ وہ عالمی ادبیات کے نبض آشنا تھے۔ عالمی کلاسیک کا انھوں نے عمیق مطالعہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے اردو، ہندی، عربی، فارسی، گجراتی اور انگریزی زبان پر اپنی خلاقانہ دسترس کا لوہا منوایا۔ اگر چہ انھوں نے مغربی ادبیات کا عمیق مطالعہ کیا تھا لیکن ان کے تخلیقی عمل اور تنقیدی بصیرت کے سوتے مشرقی اقدار و روایات اور تہذیب و ثقافت سے پھوٹتے ہیں۔ ایک زیرک، فعال اور مستعد تخلیق کار کی حیثیت سے وارث علوی نے بھرپور زندگی بسر کی۔ ابتدا میں وہ ترقی پسند تحریک سے بہت متاثر تھے۔ 1946 سے 1950 تک انھوں نے احمد آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سیکرٹری کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ احمد آباد میں ترقی پسند تحریک کے منشور کو متعارف کرانے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ سید سجاد ظہیر نے وارث علوی کی خدمات کا برملا اعتراف کیا اور ان کا ذکر اپنی کتاب روشنائی میں بھی کیا ہے۔ وارث علوی نے جلد ہی ترقی پسند تحریک سے اپنا تعلق توڑ لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر قسم کے نظریاتی حصار سے دور رہتے ہوئے تخلیق فن پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں۔ ادب میں نظریے کے مباحث کے حوالے سے وارث علوی کے خیالات پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ تخلیق ادب کے دوران ایک تخلیق کار کا کسی خاص نظریے کے حصار میں رہنا تخلیقی عمل کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ انداز فکر حریت فکر و عمل کی راہ میں سد سکندری بن کر حائل ہو جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ متنوع تصورات اور نئے نظریات سامنے آتے رہتے ہیں۔ سیل زماں کے تھپیڑے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ بہالے جاتے ہیں۔ فکر و خیال کی دنیا میں تغیر و تبدل کا یہ سلسلہ پیہم جاری رہتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی جانب سفر جاری رہتا ہے۔ یہی انسانی فطرت ہے اور اسی کو اقتضائے وقت خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ وارث علوی کا خیال تھا کہ جس طرح ریل کی پٹڑی پر رواں دواں ریل گاڑیاں بالآخر اس مقام پر پہنچ کر رک جاتی ہیں جہاں ریل کی پٹڑی ختم ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح تمام نظریات بھی ایک اپنے ایک مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے ہیں یہ ٹھہراؤ یا جمود زندگی کی حرکت و حرارت سے ہم آہنگ نہیں اسی لیے تخلیق کار کو جہد و عمل کو شعار بنانا چاہیے۔ ہمیں اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ حاصلِ سیرِ جہاں حیرت و حسرت کے سوا کچھ بھی تو نہیں جس طرح رخش عمر مسلسل رو میں ہے اسی طرح فکر و خیال اور نظریات بھی ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی کی کیفیت کے امین ہیں اور مرحلہ شوق ہے کہ کبھی طے ہو ہی نہیں سکتا۔

تخلیق ادب میں وارث علوی نے سخت ریاضت اور سعی پیہم کو شعار بنانے پر توجہ مرکوز رکھی۔ان کا خیال تھا کہ مشکوک، مہمل اور غیر معیاری ادبی تخلیقات کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھنا چاہیے۔اس سلسلے میں وہ کسی سمجھوتے کے بالکل قائل نہ تھے۔وہ ہر قسم کی عصبیت کے سخت خلاف تھے اور ان کی یہ دلی تمنا تھی کہ ادیب کو حریت ضمیر سے جینے کے لیے کسی قسم کی نظریاتی جکڑ بندی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔وہ تخلیق کاروں کو آزای ءاظہار کے مواقع فراہم کرنے کے پر جوش حامی تھے۔ان کا شمار گجرات میں ساہتیہ اکادمی کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔گجرات میں ساہتیہ اکادمی کے قیام کے بعد وہ اس اکادمی کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔اپنی انتظامی قابلیت، فہم وفراست اور تدبر کے اعجاز سے انھوں نے اس علاقے میں ساہتیہ اکادمی کو ادبی حلقوں کی ترجمان بنادیا۔ساہتیہ اکادمی کا ادبی مجلّہ ''سابرنامہ'' ان کی ادارت میں ایک رجحان ساز ادبی مجلّہ بن کر ابھرا۔ان کے متعدد مسودات اور تحریریں ابھی تشنہء تکمیل ہیں۔ان کی درج ذیل کتابیں زیر طبع ہیں:

(1) اقبال کے بعد اردو کی نظمیہ شاعری

(2) غزل کا محبوب اور دوسرے مضامین

ایک رجحان ساز ادیب اور نقاد کی حیثیت سے وارث علوی نے علم وادب کے فروغ کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں ان کی وجہ سے پوری دنیا میں ان کے لاکھوں مداح موجود ہیں۔اردو تنقید کو نیا رجحان، بلند آہنگ، منفرد انداز اور دبنگ لہجہ عطا کر کے انھوں نے قارئین ادب کو افکار تازہ کی مشعل تھام کر جہان تازہ تک رسائی کی راہ دکھائی۔۔ان کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے انھیں جن اعزازات سے نوازا گیا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(1) گورو پرسکار ایوارڈ (Gaurav Puraskar Award) : (1992)، اردو ساہتیہ اکادمی حکومت گجرات (2012)

(2) نیشنل ایوارڈ (1993): مہاراشٹر اردو اکادمی

(3) غالب ایوارڈ (2004) : غالب اکادمی دہلی

(4) عالمی فروغ اردو ایوارڈ (2008) : دوہا قطر

(5) بنگال ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

(6) بہادر شاہ ظفر ایوارڈ : دہلی

ایک وسیع المطالعہ ادیب، جری نقاد اور مستند محقق کی حیثیت سے وارث علوی نے ادبی مسائل کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے دینے میں کبھی تامل نہ کیا۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے موضوعات پر ان کے خیالات ان کی اختلافی سوچ کے متعدد نئے زاویے سامنے لاتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا کہ ترقی پسند تحریک کا اب کہیں وجود نہیں۔ 1936 میں اٹھنے والی یہ تحریک اب اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکی ہے تاہم اس تحریک نے قارئین ادب کے فکر و نظر پر دور رس اثرات مرتب کیے، ان اثرات کی بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت کے بارے میں ان کے تحفظات کی کئی وجوہات ہیں۔ بعض لوگوں کی رائے ہے کہ تاریخی حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ژاک دریدا (Jacques Derrida) جس کا عرصۂ حیات 15-07-1930 تا 09-10-2004 ہے، امریکی ایجنسیوں کے لیے کام کر رہا تھا جو یہ چاہتی تھیں کہ معاشرتی زندگی کے نشیب و فراز پر اہل قلم کی تخلیقی فعالیت کے اثرات کو محدود کیا جا سکے۔ ادیبوں کو قومی مسائل سے بیگانہ رکھ کر انھیں خیال و خواب کی دنیا کا اسیر بنا دیا جائے تا کہ وہ عوام میں زندگی کے تلخ حقائق کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے کی کوششوں میں کام یاب نہ ہو سکیں۔ اس لیے دریدا نے تخلیق ادب کو زبان اور ہیئت کے مدار میں رکھنے پر اصرار کیا تا کہ تخلیق کار ان بھول بھلیوں میں الجھ کر سرابوں میں کھو جائیں۔

مکتبی تنقید اور مدرس کی فکری نہج کے بارے میں وارث علوی نے ہمیشہ اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ جاہل کو اس کی جہالت کا انعام مل جاتا ہے۔ چربہ ساز، سارق، کفن دُزد اور لفاظ حشرات سخن کی چیرہ دستیوں نے تمام ادبی منظر نامہ گہنا دیا ہے۔ تحقیق اور تنقید کی حالتِ زار کسی سے مخفی نہیں تنقیدی نشستوں نے انجمن ستائش باہمی کی ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی ہے۔ عقابوں کے نشین زاغوں کے تصرف میں۔ اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہو گا کہ جید جاہل، خفاش منش کندہ ءنا تراش اور بُزِ اخفش رواقیت کے داعی بن بیٹھے ہیں۔ جب سے سندی تحقیق کے ساتھ مدرسین کو مالی منفعت اور اضافی ترقیوں کی جھلک دکھائی گئی ہے، تحقیق اور تنقید کو بازیچہ ءاطفال بنا دیا گیا ہے۔ اب ہر مدرس جلد از جلد ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کر کے زر و مال سمیٹنے اور خود کو اعلا تعلیم یافتہ ثابت کرنے کے لیے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی فکر میں مبتلا ہے تعلیمی اداروں میں مدرسین کی صورت میں جو نام نہاد نقاد براجمان ہیں، ان کی بوالعجبیوں اور خام خیالی نے ہمیں اقوامِ عالم کی صف میں تماشا بنا دیا ہے۔ تحقیق

اور تنقید کے نام پر جو گل کھلائے جا رہے ہیں انھیں دیکھ کر ناطقہ سر بہ گریباں ہے کہ اس کے بارے میں کیا کہا جائے اور خامہ انگشت بہ دنداں ہے کہ اس سانحے کے متعلق اپنے جذبات حزیں کا اظہار کن الفاظ میں لکھا جائے۔ اپنے ایک مضمون ''روح کی اڑان'' میں وارث علوی نے اس لرزہ خیز، اعصاب شکن اور روح فرسا المیہ کے تضادات، ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں کے بارے میں ہمدردانہ شعور اجاگر کرتے ہوئے نہایت دردمندی اور خلوص سے لکھا ہے:

''مدرسہ کی فضا ہی ایسی ہوتی ہے کہ لسان العصر، بلبل شیراز اور طوطیء ہند سب سُرمہ پھانک لیتے ہیں۔ صرف مدرس ہے جو ٹراتا رہتا ہے اور کلاس روم کے در دیوار ان معلومات سے گونجتے رہتے ہیں جن کا توانا تخلیقی تجربات سے دور کا بھی سروکار نہیں ہوتا۔ ہر ذی روح کی طرح مدرس بھی عمرِ دراز کے چار دن مانگ کر لاتا ہے۔۔۔۔دو پی ایچ۔ڈی کے موضوع کی تلاش میں اور دو موضوع پر ''کام'' کرنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ مدرس کے لیے پی ایچ۔ڈی کے مقالے کی وہی اہمیت ہے جو داستانی عہد کے سورماؤں کے لیے ہفت خواں کی ہوا کرتی تھی کہ ہفت خواں نہ ہوں تو سورماؤں کے لیے کنویں میں جھانکنے کے سوا کوئی کام ہی نہ رہتا۔ مدرس ان عجوبہء روزگار لوگوں کی اولادِ معنوی ہے جو اگلے زمانے میں چاول پر قل ہو اللہ لکھا کرتے تھے، کہ اُن ادیبوں پر بھی جن کا ادبی جثہ چاول کے دانہ سے کچھ ہی بڑا ہوتا ہے پانچ سو صفحہ کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنا اس کے دائیں ہاتھ کا کھیل ہے''(1)

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مدرس جب مکتبی تنقید کی صورت میں پنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھانے کے لیے تحقیق و تنقید کی وادی میں داخل ہوتا ہے تو زندگی کے تمام حقائق اس ابلہ کے ابلق کے سموں کی گرد میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔ تاریخ، نفسیات، ادبیات، علم بشریات اور عمرانیات کے بارے مدرس کا علم بے حد محدود ہوتا ہے۔ اپنی نام نہاد تحقیق میں وہ جو نتائج پیش کرتا ہے وہ اس قدر گم راہ کن ہوتے ہیں کہ قاری اس مجرمانہ اسلوب اور پشتارہ اغلاط کو دیکھ کر سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ رولاں بارتھ (Roland Barthes) جس کا عرصہء حیات 12-11-1915 تا 26-03-1980 ہے، وہ بھی مکتبی تنقید کے مسموم اثرات سے آگاہ تھا۔ اُس کے خیالات اور وارث علوی کے خیالات میں گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ مکتبی تنقید پر گرفت کرتے ہوئے رولاں بارتھ نے لکھا ہے:

''مکتبی تنقید متن کے صرف متعینہ طے شدہ معنی کو صحیح سمجھتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے اس پر اصرار کرتی ہے۔ متعینہ معانی تو صرف لُغوی معنی ہو سکتے ہیں اور ادب میں اکثر و بیش تر بے ہُودگی کی حد

تک غلط ہوتے ہیں۔مکتبی نقادوں کے بارے میں بارتھ نے لکھا ہے کہ ان کا ذہن چھوٹا اور نظر محدود ہوتی ہے وہ ادعائیت کا شکار ہیں اور ادب میں اکثریت کے علم بردار ہیں؛اس لیے ادب کے لطف و نشاط میں شرکت کے لیے ان کی آمریت کو تہس نہس کرنا ضروری ہے،''(2)

اللہ کریم نے وارث علوی کو ذوق سلیم اور اعلا جمالیاتی حِس سے متمتع کیا تھا وہ ادب پارے کے حسن کو پرکھنے میں اپنی مثال آپ تھے۔بلند پایہ تحریریں پڑھ کر وہ ذہنی سکون اور جمالیاتی سرور حاصل کرتے تھے لیکن جب کسی متشاعر اور جعل ساز کی کوئی ناقص تحریر ان کی نظر سے گزرتی تو شدید کرب میں مبتلا ہو جاتے۔ان کی تنقیدی تحریروں میں کئی مقامات پر طنز کا شائبہ ہوتا ہے۔اس کے پس پردہ بھی ان کا داخلی کرب کارفرما ہے۔وہ اپنے آنسو ہنسی کے خوش رنگ دامنوں میں چُھپانے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ تخلیقی فن کار اپنی تمام خداد صلاحیتوں اور ذہنی قوتوں اور بصیرتوں کو روبہ عمل لا کر ارفع خیالات کو صفحہء قرطاس پر منتقل کریں۔حسن و جمال کی مرقع نگاری اور حقائق کی گرہ کشائی سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔وہ حق گوئی اور بے باکی کو ایک ایسی اخلاقی قدر سے تعبیر کرتے تھے جو زندگی کے ہر شعبے میں انسان کو خود اپنی نظروں میں باوقار بنا دیتی ہے۔وہ بے سرو پا باتوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ایسے لوگ جو بے پر کی اڑانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور جو اپنے ممدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں،ان کو وہ ہمیشہ ہدفِ تنقید بناتے رہے۔بدقسمتی سے ہمارے مکتبی نقادوں نے اپنی کورمغزی کے باعث تنقید کی ثقاہت کو شدید ضعف پہنچایا ہے۔مدرس جس طرح ہر فن مولا بن کر ہر موضوع پر بے تکان بے مقصد اور مہمل تحریریں لکھ کر وقت اور محنت کا ضیاع کر رہے ہیں اس پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے وارث علوی نے لکھا ہے:

''مدرس ہر مضمون پر لکھ سکتا ہے، ہر مجموعہ کلام پر تبصرہ لکھ سکتا ہے، ہر کتاب پر اپنی رائے دے سکتا ہے جو دوسروں کے کام آئے حالانکہ بہت سی کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی تزکیہ نفس اور راہِ سلوک کے آخری مقام پر پہنچ کر بھی ان کے متعلق لب کشائی کرے تو بھنچے ہوئے لبوں سے سوائے بے نقط ملفوظات کے کچھ باہر نہ نکلے لیکن مدرس بے نقط کبھی نہیں بولتا۔جب بھی بولتا ہے تنقید ہی بولتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب تک مدرس کے دم میں دم ہے وہ کسی شاعر کو طبعی موت مرنے نہیں دیتا۔وہ جو دوسروں کے لیے مر گئے وہ بھی حنوط شدہ ممیوں کی طرح مدرس کے مقالوں میں زندہ ہیں۔جن شاعروں پر نول کشور فاتحہ پڑھ چکے،ان کا عرس منانے کے لیے مدرس ماوراالنہر سے چلتا ہے تو پانی پت میں آ کر دم لیتا

ہے۔''(3)

معاشرتی زندگی میں نظام اقدار کے تحفظ کو وارث علوی نے ہمیشہ کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا۔انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے انھوں نے قلم وقرطاس کا سہارا لیا۔نھوں نے زندگی بھر قلم کی حرمت کو ملحوظ رکھا اور بے لوث محبت ،اخوت ،ایثار اور قناعت کو اپنا نصب العین بنایا۔انسانیت کے ساتھ محبت ان کی جبلت میں داخل تھی۔ان کا جذبہ انسانیت نوازی نھیں عظیم انسان کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ان کے لاشعور میں انسانیت کے ساتھ قلبی لگاؤ اور محبت کے غیر مختتم جذبات سرایت کر گئے تھے۔ان کی تحریریں اسی محبت کی تنظیم کی ایک لائق صد رشک صورت ہیں۔انسانیت کے ساتھ والہانہ محبت ان کے لیے ذہنی سکون ،روحانی مسرت اور اطمینانِ قلب کا وسیلہ بن جاتی ہے۔اپنی تحریروں میں وارث علوی نے ہمیشہ اس موضوع کا انتخاب کیا جو انسانی ہمدردی اور محبت کا آئینہ دار ہو۔مادی دور کی لعنتوں نے ہوس زر کو ہوا دی ہے اور اس کے نتیجے معاشرتی زندگی میں خوف ناک بگاڑ اور انتشار پیدا ہو گیا ہے۔مسلسل شکستِ دل کے باعث فرد اپنی ذات کی تنہائی کے اذیت ناک ماحول میں بے حسی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔یہ کیفیت کسی بھی معاشرے کی بقا کے لیے بہت بُرا شگون ہے۔وارث علوی نے جان لیوا تنہائی کے کرب کے بارے میں نہایت خلوص کے ساتھ اپنا مطمح نظر پیش کیا ہے جو قارئین ادب کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ان کا انداز فکر زندگی کی حقیقی معنویت کا مظہر ہے:

''تنہائی کے کرب کا علاج محبت ہے۔محبت آدمی کو ذات کے صنم کدے سے باہر نکال کر غیر ذات سے جذباتی اور حیاتیاتی رشتہ قائم کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔''(4)

تنقید میں وارث علوی کے اسلوب کے جہاں بے شمار مداح تھے وہاں بعض حلقوں کی جانب سے اعتراضات بھی سامنے آئے۔ان کی تنقید کو کلیم الدین احمد کے مانند یک طرفہ اور سخت انداز کی حامل سمجھا گیا۔وارث علوی نے اس نوعیت کے اعتراضات کو مسترد کرتے ہوئے تنقید میں اپنا دبنگ لہجہ اور منفرد اسلوب زندگی بھر برقرار رکھا۔ہزار خوف میں ان کی زبان نے ہمیشہ ان کے دل کا ساتھ دیا۔ستائش اور صلے کی تمنا سے بے نیاز رہتے ہوئے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے والے اِس زیرک، فعال ،مستعد اور جری تخلیق کار نے ہمیشہ لفظ کی حرمت کو ملحوظ رکھا۔حریت فکر کے اس عظیم مجاہد نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حق گوئی اور بے باکی کو اپنا نصب العین بنایا۔ لفاظ حشراتِ ادب کی جعل سازی ،سرقہ بازی اور کفن دُزدی کی اساس پر استوار ہونے والے عظمت کے چور محلوں کو

انھوں نے تیشۂ حرف سے پاش پاش کر دیا۔ اپنے تنقیدی اسلوب کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''میں جب ڈھائی تولے کے شاعر کو سُورما اور تنقید کے بونے کو باون گزا کہنے سے اِنکار کرتا ہوں تو لوگ میری زبان کو غیر مہذب کہتے ہیں۔''(5)

شام الم ڈھلتے ہی جب درد کی ہوا چلتی ہے تو تنہائیوں کا زہر آدمی کے ریشے ریشے میں سرایت کر جاتا ہے۔ تنہائی ایک مسلسل عذاب کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اس کے مسموم اثرات سے بچنے کے لیے محبت ہی واحد حل ہے۔ تنہائی کے زہر کا تریاق محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔ محبت کے معاملے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس میں سود و زیاں کا کوئی دخل نہیں۔ جہاں تک فہم و فراست اور ہوش و خرد کا تعلق ہے اگر یہ مصلحت اور سود و زیاں کو پیش نظر رکھے تو یہ اس کی پختگی کی دلیل ہے۔ اس کے برعکس اگر محبت میں مصلحت اور نقصان کا خیال کیا جائے تو یہ محبت کے ناپختہ ہونے کا ثبوت ہے۔ وارث علوی نے ہمیشہ انسانیت کے ساتھ والہانہ محبت کے جذبات کا اظہار کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارے جہاں کا درد ان کے جگر میں سمٹ آیا تھا۔ وارث علوی کی وفات سے اردو زبان و ادب کو ایک ایسے تخلیق کار سے محرومی کا نقصان اٹھانا پڑا ہے جس نے انسانیت کے وقار اور سربلندی کو ہمیشہ اولیت دی۔ اردو تنقید کو حریت فکر کی راہ دکھائی اور ہر قسم کی عصبیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ آج ایسا کوئی تخلیق کار دکھائی نہیں دیتا جسے وارث علوی جیسا کہا جا سکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ اللہ کریم ان کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تمھارے بعد کہاں وہ وفا کے ہنگامے
کوئی کہاں سے تمھارا جواب لائے گا

مآخذ:

(1) وارث علوی: ''روح کی اڑان''، مضمون مشمولہ ماہ نامہ چہارسو، راول پنڈی، جلد 22، شمارہ جنوری۔ مارچ 2013، صفحہ 11۔

(2) بہ حوالہ گوپی چند نارنگ: ساختیات پسِ ساختیات اور مشرقی شعریات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994، صفحہ 163۔

(3) وارث علوی: ''روح کی اڑان''، صفحہ 11۔

(4) وارث علوی: تیسرے درجے کا مسافر، نگارشات، لاہور، 1986، صفحہ 116۔

(5) وارث علوی: ''روح کی اڑان''، صفحہ 8۔

☆☆☆

دیا نرائن نگم کا اقبال

(ش)

(1)

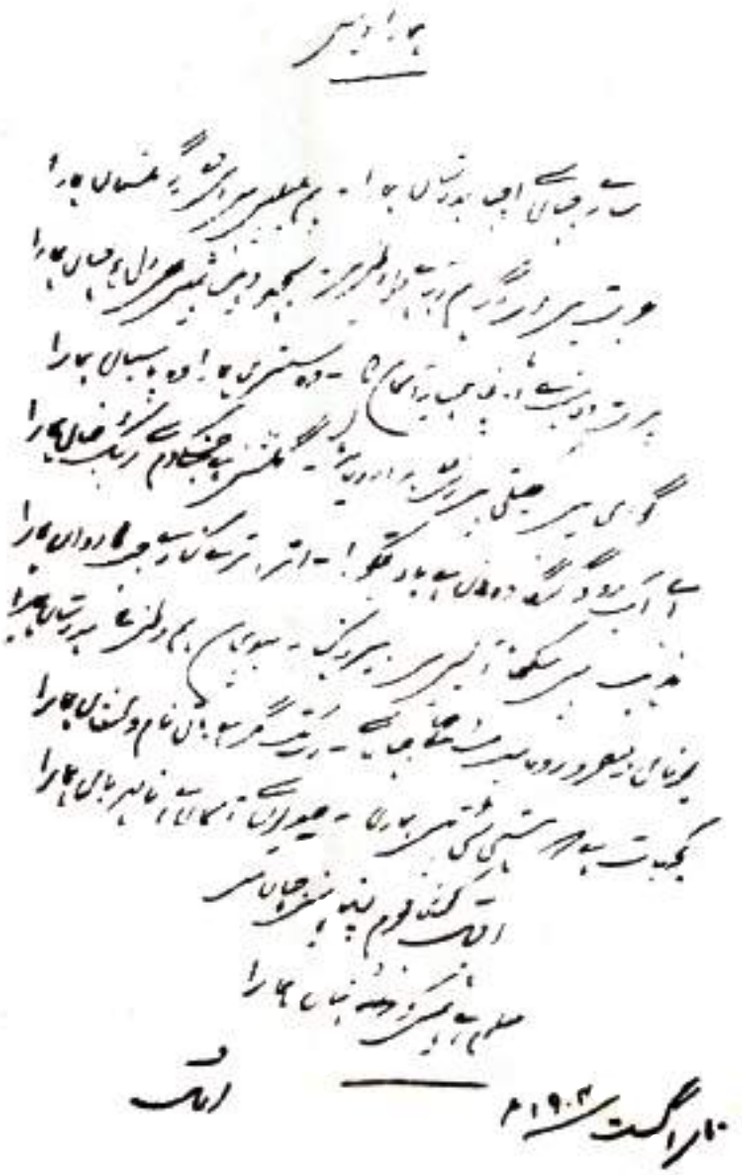

(اقبال پہلی بار نگم کے رسالہ **زمانہ** میں)

پیش گفتار

اردو کا سب سے بڑا ادبی رسالہ 'زمانہ' جو انیس سو تین میں شروع ہوا اور انیس سو انچاس تک جاری رہا، ایک عہد ساز پرچہ تھا۔ ہمارے لئے یہ اقبال کی وجہ سے دل سے اور زیادہ قریب ہے کہ اردو والوں کے لئے دیا نرائن نگم اور اقبال دونوں کی مشترک سوغات!

O

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا

اقبال کی یہ نظم ۱۹۰۵ء میں پہلی بار نگم نے اپنے ماہنامہ 'زمانہ' میں شایع کی۔ یہ اقبال، اور نگم، دونوں کی متحدہ ہندستان کو سب سے بڑی سوغات تھی۔ اور آج یہ آزاد ہندستان کو ان دونوں کی وطن عزیز کے لئے عظیم ترین دَین بن گئی ہے، جس کے بڑے قومی ترانوں میں بیسویں صدی کے آخری ربع میں وطن عزیز کا پیارا ترانہ بن گیا ہے۔ اور ٹیگور کے تصنیف کردہ جن گن من کے بعد اقبال کا یہ تصنیف کردہ ترانہ بھی ہر دل میں گھر کر گیا ہے۔ اب سے تین دہائی پہلے تک یہ اقبال کے ہاتھ کے خود اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل مسودہ کی شکل میں نگم گھرانے میں محفوظ تھا۔ اب خدا جانے کہاں ہو: بلاشبہ نگم گھرانے کی یہ سب سے بڑی دولت ہے!

نگم نے اس یادگار نظم کو پہلی بار زمانہ میں شایع کیا تھا۔ پھر ۱۹۰۶ء میں (من جملہ اور مشاہیر کے) سودیشی تحریک پر اقبال کی ایک طویل نثری تحریر 'زمانہ' میں شایع ہوئی (موجودہ پیشکش کے آخر میں پیش کر دی ہے)۔ یہ ''نگم کے اقبال'' سے ہمارے اولیں تعارفات

تھے۔ پھر نگم اور اقبال مدت العمر ایک دوسرے کے قدر دان رہے۔ حتّٰی کہ انّیس سو اڑتیس عیسوی کے جنوری مہینہ کے 'زمانہ' میں بھی، نگم نے اقبال کا جشن پورے ہندستان میں منایا جانے پر 'زمانہ' میں اس کا خصوصی نوٹس لیا ہے اور اس پر اپنی دلی خوشی کا اظہار کیا۔

نگم اقبال دوستی ساری عمر چلتی رہی، کبھی اقبال اپنی نظمیں خود اشاعت کے لئے ان کو بھیج دیتے تھے، کبھی وہ خود اقبال کی کسی بھی جگہ چھپی ہوئی نظم/شعر اپنے پرچے میں کشکول کے عنوان سے نقل کر دیتے تھے (جیسے غیرت تیموری، ابر) مآخذ میں مولانا ابوالکلام کا البلاغ اور مولوی عبدالحق کا رسالہ اردو قابلِ ذکر ہیں۔

O

ماہنامہ زمانہ کے مختلف پرچوں میں اقبال سے متعلق جو کچھ بھی چھپا، ان کی نظمیں، ان کے بارے میں خبریں، ان کے مجموعوں پر تبصرہ یا تنقید، ان کے تتبع میں کہی ہوئی نظمیں، ان پر معترضانہ نظمیں رمضامین، غرض کہ اقبالیات کے ذیل میں جو کچھ بھی آ سکتا ہے وہ سب زمانہ کے صفحات میں آپ کو مل جائے گا۔

خبروں یا علمی خبروں کے تحت اقبال کے بارے میں جو اطلاعیں وقتاً فوقتاً نگم کو پہنچتی رہیں وہ اپنے رسالہ زمانہ میں شائع کرتے رہے۔

پھر آنند نارائن ملاّ نے اقبال سے جو شکوہ کیا ہے، پیار و محبت سے بھرا شکوہ وہ بھی زمانہ نے شائع کیا، ملاّ کو شکوہ ہے کہ اقبال بدلتے جا رہے ہیں۔

ہماری اقبالیات کا اگلا سیکشن اقبال کے تتبع میں لکھی گئی نظموں پر ہے۔ ضامن کنتوری کی نظم ہندستان ''اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندستاں'' کی بحر و قوافی میں ہے۔ سفیر کاکوروی کی نظم ''ترانہ قومی''، جو شروع تو ایسے ہی ہوتی ہے کہ ''مرحبا اے خاک پاک کشور ہندستاں''، یعنی وہی 'ہمالہ' والی نظم کو سامنے رکھتے ہوئے! مگر پھر اسے مسدس کی شکل دے دی ہے۔ پھر کلیم

اعظم گڑھی (ابھی اعظمی لکھنے کا رواج عام نہیں ہوا) کی نظم ہے جو بالاعلان ''بہ تتبع جناب اقبال'' ہے اور جو ''میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے'' کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ بس ٹیپ کا مصرع بدل گیا ہے یعنی ''اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے''۔ اگلی نظم جگن ناتھ آزاد کے والد اور اس دور کے رسائل میں خوب چھپنے والے تلوک چند محروم کی نظم ''ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت'' ہے۔ اگلی نظم اشہری کی ہے جو ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کے تتبع میں تقریباً اتنے ہی اشعار پر مشتمل ہے، اشہری سے مراد اس زمانہ کے مشہور مصنف امجد علی اشہری ہیں۔ اگلی نظم تضمین ہے اقبال کی نظم امام ہند کو سامنے رکھ کے۔

پھر بانگِ درا کے وزن پہ نکلی کتاب پیغام درا پر تبصرہ ہے۔ یہ ''مولوی سید برکت علی صاحب گوشہ نشیں، رئیس فیروز پور پنجاب'' کے منظوم کلام کا مجموعہ ہے۔

ہمارے اقبالیات کا اگلا سیکشن اقبال کی نثری تصانیف کا جائزہ ہے، جس کے تحت سب سے پہلے تو اقبال کی کتاب ''علم الاقتصاد'' پر نگم کے قلم سے تبصرہ ہے۔ پھر اسی کتاب پر ایک تفصیلی، تنقیدی مضمون ہے، جس پر مضمون نگار کا نام نہیں ہے، تاہم یہ ایڈیٹر کا مضمون نہیں ہے۔ ایسے تفصیلی مضمون، تنقید کے عنوان کے تحت، جب بھی زمانہ میں چھپے، ان میں اچھی خاصی بلکہ کڑی نکتہ چینی ہوتی تھی۔ یہ کڑا پن اس مضمون میں بھی قائم ہے جو ایڈیٹر کے تبصروں میں نہیں ہوتا (یہ تبصرے غالباً نوبت رائے نظر لکھا کرتے تھے)۔ یوں بھی ایڈیٹر کے تبصرے نرم تو ہوتے ہی ہیں مختصر بھی ہوتے ہیں، یہ تبصرے اسی سیکشن میں بانگ درا، اور پیام مشرق پر موجود ہیں۔

اس کے بعد کے سیکشن میں اقبال کا کلام شروع ہوتا ہے۔ پہلی نظم فارسی میں ہے: ''نصیب ما ز جہاں ست بقدر ہمت ما'' (جہاں ست کتابت کی غلطی ہے شد پڑھا جائے)، جس پر زمانہ کے مشہور مصنف لفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ کا ایک صفحہ کا مبصرانہ خط ہے جس میں اقبال کے اردو کلام کی تعریف ہے مگر ان کے فارسی اشعار پر بڑا 'بے رحم' تبصرہ ہے اس پر مستزاد کرنل صاحب

نے ایک ۹ راشعار پر مشتمل اقبال ہی کی بحر اور ردیف وقافیہ میں ایک نظم لکھ دی ہے، ہم نے یہ نظم بھی نقل کر دی ہے۔ زمانہ کے اگلے پرچے میں ''ڈاکٹر اقبال وکرنیل بھولا ناتھ'' کے عنوان اور ''مباحثہ'' کے ذیلی عنوان سے کئی صفحوں پر پھیلی ہوئی ایک تحریر (بشکل خط) ہے، لکھنے والے ہیں ''خواجہ عبدالواجد ندوی سابق سب ایڈیٹر الہلال''۔ ایڈیٹر صاحب نے اسی مارچ کے پرچے میں دے دیا ہے جس میں کرنل صاحب کا اعتراضیہ شامل ہے۔ یہ خواجہ عبدالواجد مولانا آزاد کے الہلال میں سب ایڈیٹر تھے اور الہلال کے بند ہونے کے پانچ چھ سال بعد بھی اس کی یادیں سینے سے لگائے ہوئے تھے۔ خواجہ صاحب کے مضمون میں کرنل صاحب کے اعتراضوں کا تفصیلی جواب ہے اور بلکہ انداز یہ ہے کہ 'دیکھیں اس سہرے سے بڑھ کر کوئی کہہ دے سہرا'۔ کرنل بھولا ناتھ بھی لاہور ہی کے تھے اقبال سے عمر میں چند سال بڑے تھے، بطور ڈاکٹر فوج میں سروس تھی اور اچھے سخن شناس تھے۔ اوپر مذکور مباحثہ کے کئی ماہ بعد، نومبر کے پرچے میں، کرنل بھولا ناتھ کے بارے میں دو تحریریں ہیں، ایک تعارف جب وہ زندہ تھے اور دوسری، معاً بعد ایک تعزیتی تحریر جب کرنل صاحب کا دفعۃً انتقال ہو گیا۔ یہ دونوں مضمون غالباً نگم صاحب ہی کے قلم سے رہے ہوں گے۔

ہمارے اگلے باب میں ان کے مجموعۂ کلام پر تبصرے ہیں (بانگِ درا اور پیامِ مشرق) اور اب کلامِ اقبال کے اولیں ورژن آپ کے ملاحظہ میں آئیں گے۔ کلام کے سلسلے میں ایک پُر لطف بات قابلِ توجہ ہے کہ زمانہ کے مستقل پڑھنے والے اور اقبال کے بڑے قدر دان کرنل بھولا ناتھ کی، اقبال کی تصنیف کردہ ایک فارسی نظم پر تنقید ہے، خاصی بحث چلی ہے۔ یہ افسوسناک بات ہے کہ کرنل بھولا ناتھ کے قلم سے مزید کچھ یادگار نہیں رہ گیا، چند ماہ بعد انکا انتقال ہو گیا۔ ابھی تک جب ہم انکا ذکرِ خیر کر رہے ہیں تو ایک صدی گزرنے کے بعد بھی اتنے پیارے آدمی کی یاد آ رہی جس نے کلامِ اقبال پر تنقید کی تھی۔ بلکہ انکی نظم کے جواب میں ایک فارسی نظم بھی لکھ دی

تھی جو نگم نے شایع بھی کی تھی۔ بڑے اچھے ذوق کے مالک تھے اللہ ان کی اور نگم صاحب کی مغفرت کرے۔

سیکشن تو یہ اقبال کے کلام پر تھا مگر بات مرحوم کرنل کے تبصرہ و جواب تبصرہ پر چھڑ گئی تھی اس لئے ''کلام'' ہی کے ذیل میں یہ مباحثہ بھی دے دیا گیا، جس کے خاتمہ پر اقبال کا کلام پھر شروع کر دیا گیا ہے۔ اور اب صرف اردو کلام ہی ہے فارسی کلام بس اتنا ہی چھپا جس پر کرنل صاحب کا تبصرہ تھا البتہ فارسی ایک جگہ پھر در آئی ہے جب اقبال نے عرفی کے شعر:

نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر میخواں چو محمل را گراں بینی

کی تضمین کی ہے۔ عرفی کے اس فارسی شعر کے سوا باقی پوری نظم اردو ہی میں ہے۔ یوں بھی یہ نظم مولانا آزاد کے البلاغ سے منقول ہے اور بھولا ناتھ مباحثہ سے تین سال قبل شائع ہوئی تھی اور البلاغ سے نقل ہو کے آئی تھی۔ (کشکول کے عنوان سے، دوسرے کسی رسالہ سے نگم اپنی دلچسپی کی کوئی چیز نقل کر دیتے تھے، اقبال کی چند نظمیں نقل ہوئیں ایک رسالہ اردو سے؛ دوسری الہلال سے؛ اور ابھی جو مذکور ہوا، ایک نظم البلاغ سے)۔

فارسی کے ذکر میں یہ مزید عرض کر دیا جائے کہ ۱۹۲۴ء کے اکتوبر میں اقبال کی ایک نظم تنہائی البتہ فارسی میں آئی: تبسمے بہ لب او رسید و ہیچ نہ گفت۔ (اب کرنل بھولا ناتھ تو اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اس لئے ان کا کوئی اعتراض ہم خاکی انسانوں تک تو پہنچ نہیں پایا، کوئی نہ کوئی اعتراض کیا ضرور ہوگا!) اسی عنوان یعنی تنہائی کے تحت دو ماہ بعد ان کی ایک اردو نظم کے پانچ شعر بھی زمانہ کی زینت بنے۔

کلام اقبال کے ذیل میں ان کی نظم غلام قادر روہیلہ بھی نقل ہوئی ہے۔ اس کے سلسلہ میں یہ کہنا ہے کہ مشہور مؤرخ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے اس کا جواب ایک نظم میں لکھا تھا جو کبھی ہماری نظر سے گذری تھی، اس کا مأخذ محفوظ نہیں، خلاصہ البتہ یہ تھا کہ اقبال کے سامنے جو

تاریخی روایت کسی نے دہرائی، واقعہ اس طور پر نہیں تھا بلکہ بات یوں تھی کہ روہیلہ نے دلّی پر قبضہ کر کے شاہ عالم سے درخواست کی تھی کہ بیرونی حملوں سے مدافعت کے لئے اور فوجی طاقت کو مضبوط تر کرنے کے لئے شاہ عالم کے قلعہ میں جمع کیا ہوا خزانہ ہے، اس سے روہیلہ کی مدد کریں۔ بادشاہ اس پر راضی نہ ہوئے، جس کے نتیجہ میں یہ حادثہ برپا ہوا۔

کلام اقبال کے ذیل میں چند اشعار کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا اور قند مکرر کے طور سے ملاحظہ میں لانا ، نامناسب نہ ہوگا :

اے شیخ و برہمن سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قربانی یا جھٹکا ہے

وید منتر کے عنوان سے تین شعر اور بھی قابل توجہ ہیں :

خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو　　احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو
روشن میرے سینے میں محبت کا شرر ہو　　دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو
پہلو میں میرے دل ہو سے آشامِ محبت
ہر شے ہو میرے واسطے پیغام محبت

(ش)

فہرست

پیش گفتار، ۶۵

اقبال کے بارے میں خبریں، ۷۳

شکوہ از اقبال (از پنڈت آنند نراین ملا)، ۷۹

اقبال کے تتبع میں، ۸۲

- ہندوستان (از ضامن کنتوری)، ۸۳
- ترانۂ قومی (از سفیر کاکوری)، ۸۴
- ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت (از تلوک چند محروم)، ۸۶
- اپنے وطن پہ صدقے، بہ تتبع جناب اقبال (از کلیم اعظم گڑھی)، ۸۷
- تضمین بر اشعار ڈاکٹر اقبال (از تلوک چند محروم)، ۸۸
- ہندوستان (از امجد علی اشہری)، ۸۹
- پیغام درا (از سید برکت علی ''گوشہ نشیں'' فیروز پور، پنجاب)، ۹۰

اقبال کی نثری تصانیف کا جائزہ، ۹۲

- علم الاقتصاد (از ادارہ 'زمانہ')، ۹۳
- تنقید علم الاقتصاد (مصنف نامعلوم)، ۹۴

مجموعۂ کلام پر تبصرے، ۹۹

- بانگ درا، ۱۰۰
- پیام مشرق، ۱۰۱

کلام اقبال (۱)، ۱۰۲

- نصیب ما ز جہاں ست بقدر ہمت ما، ۱۰۳

-مراسلت (ازلفٹنٹ کرنل بھولا ناتھ)،۴۵
نصیب ماز جہاں شد بقدر ہمت ما (از کرنل بھولا ناتھ)،۴۶
مباحثہ ڈاکٹر اقبال و کرنل بھولا ناتھ،۷۴
اقبال کے ناقد، کرنل بھولا ناتھ کے تعارف میں،۵۵
-کرنل بھولا ناتھ (۱)،۵۶
-کرنل بھولا ناتھ (۲)،۵۹
کلام اقبال (۲)،۶۱
-کلام اقبال (بخت مسلم کی شب تار سے ڈرتی ہے سحر)،۶۲
-ابر،۶۳
-ہمارا تاجدار (ہمائے اوج سعادت ہو آشکارا اپنا)،۶۴
-کشکول: ایک آرزو (دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب)،۶۵
-اقبال اکبر کے رنگ میں،۶۶
-کشکول: غیرت تیموری (روہیلا کس قدر اؒ)،۶۸
-کلام اقبال: ایک وید منتر کا ترجمہ (خویشوں سے ہو اندیشہ نہ غیروں سے خطر ہو)،۶۹
-نوا را تلخ تر می زن چو ذوق نغمہ کم یابی (محل ایسا کیا تعمیر اؒ)،۷۰
-چھوڑ دے (مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے)،۷۱
- جنگ اور اہلِ ہند، ۷۲
- پیغام اقبال، ۷۴
- تنہائی (فارسی)، ۷۵
- تنہائی (اردو)، ۷۶
- رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے، ۷۷
- بے سلطنت قوم یا جسم بے روح، ۷۸
اقبال کے ابتدائی عہد کی ایک نثری تحریر: سودیشی تحریک، ۷۹

.....

اقبال کے بارے میں خبریں

سر اقبال ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور کو اس سال گورنمنٹ نے سر کا خطاب عطا فرمایا ہے۔
علامہ اقبال اپنی عالمگیر شہرت کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے علمی کارنامے ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ
میں بھی خوب مقبول ہیں۔ آپ کی نظم و نثر کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں۔ شکوہ، جواب شکوہ، شمع و شاعر وغیرہ وغیرہ آپ کی بیش بہا تصانیف ہیں مگر یہ تصنیف ہے جس کا نام
چونکہ ابھی تک اس وقت آپ علامہ اقبال نے ترجمان حقیقت، اقبال کے نام سے مشہور تھے۔ اب دیکھنا ہے کہ سر کے خطاب کے بعد آپ
کی کیا حیثیت ہوتی ہے۔ بہرحال ہم علامہ اقبال کی خدمت میں مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے
خوشی میں ایک شعر کہا ہے ؎ قوت پرواز کی غالب ملکوت کی ادا پہلے تھے علامہ اقبال اب سر ہو گئے

زمانہ جنوری ۱۹۲۱ء

علمی خبریں اور نوٹ

نہایت خوشی کی بات ہے کہ سر محمد اقبال صاحب کے اردو نظموں کا مجموعہ "بانگ درا" کے نام سے شایع ہو گیا ہے۔

مخزن اگست و ستمبر ۱۹۲۴ء

ڈاکٹر" سر اقبال نے "الٰہیات اسلامیہ وفلسفہ جدیدہ" پر مدراس میں چھ خطبے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر علالت کی وجہ سے دسمبر ۱۹۲۸ء کے آخر ہفتے میں آپ نے مندرجۂ ذیل صرف تین عنوانات ہی پر خطبے دیے۔

(۱) علم اور وحی والہام (۲) وحی والہام کی تصدیقات کا فلسفیانہ معیار

(۳) ذاتِ خدا کا اسلامی تصور اور دعا کا مفہوم۔

باقی تین عنوانات یعنی (۱) مسئلۂ حیرو تقدر روحیات بعد الموت (۲) علم النفس کی رُو سے اسلامی تہذیب و تمدن کا حقیقی مفہوم اور (۳) ایک جماعت کی حیثیت سے اسلام کی تشکیل۔ آیندہ سال کے لیے ملتوی کر دیے گئے ہیں۔

ولمنہ زمدی ۱۹۲۹ء

ڈاکٹر سر محمد اقبال کو ہندوستان کی ادبی دنیا میں غیر فانی عزت و شہرت حاصل ہے نیز غیر ممالک میں بھی آپ کے کلام کی کافی قدر ہو رہی ہے چنانچہ آپ کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" کا مکمل ترجمہ انگریزی میں شائع ہو چکا ہے اور "پیام مشرق" کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی انگریزی اور جرمنی زبانوں میں شائع ہو گیا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب موصوف کی ایک اور تصنیف بھی مکمل ہو گئی ہے جو اٹلی کے شاعر اعظم ڈینٹے کی مشہور و مقبول نظم "ڈوائن کامیڈی" (Divine Comedy) کے جواب میں لکھی گئی ہے ڈینٹے نے مشہور شاعر ورجل کو اپنا رہبر بنا کر جنت و دوزخ وغیرہ کی سیر کی اور وہاں کے مناظر کو دنیا کے روبرو پیش کر کے ناموری حاصل کی تھی۔ اقبال نے مولانا روم کو اپنا رہبر بنا کر سبع سیارہ کو اپنی سیر و سیاحت کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ ڈینٹے نے اپنی نظم میں اسلام کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ڈاکٹر اقبال نے اس کا نہایت برجستہ جواب بھی دیا ہے۔ لطف یہ کہ اس جواب میں ڈینٹے کے مذہب یا اعتقادات سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے بلکہ پیغمبر اسلام کے محاسن ذاتی کو اس طرح نمایاں کر دیا ہے کہ ڈینٹے کے اعتراضات خود بخود رد ہو جاتے ہیں۔ یہ جدید ادبی کارنامہ جس کا نام "جاوید نامہ" ہے، فی الحال زیر طبع ہے۔

زمانہ اپریل ۱۹۳۱ء

۱۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو لاہور، راولپنڈی، حیدرآباد، میسور و مدراس وغیرہ ملک کے خاص خاص مقامات میں قدردانان ادب نے "اقبال ڈے" منا کر ملک کے شاعر اعظم کے ساتھ اپنی عقیدت و قدردانی کا اظہار کیا۔ جابجا عوام و خواص جلسے ہوئے اور ہر جگہ کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی اور بڑے بڑے نکتہ شناس حضرات نے داد سخن دی۔ لاہور میں ایک قدردان نے علامہ ممدوح کے صاحبزادے کو چار مربعہ اراضی کے بھی نذر کر کے ملک کے بڑے بڑے رئیسوں کے سامنے ایک قابل تقلید مثال قائم کی ہے۔

ہم زمانہ کے آئندہ نمبر میں ممدوح کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ایک سیر حاصل مضمون شائع کر رہے ہیں

شکوہ از اقبال

شکوہ از اقبال

از پنڈت آنند نرائن صاحب ملا۔ ایم۔ اے، ایل ایل بی

تو کعبے کا دلدادہ تھا۔ تو بتخانے میں کیوں آیا؟ — مئے سے تجھکو پرہیز اگر تھا، میخانے میں کیوں آیا؟
گر تیری چشم باطن میں نورِ حسنِ صحرائی تھا! — کیوں گلشن میں آکر پھر تو محوِ نظارہ سیرائی تھا!
ہندی ہونے پر ناز جسے کل تک تھا حجازی بن بیٹھا — اپنی محفل کا رہنما پرانا۔ آج نمازی بن بیٹھا!
اے بلبل! چھوڑ کے شاخِ گل کیوں خارِ چمن میں بیٹھا ہے — کیا ذوقِ اسیری ہے تجھکو، جو جا کے قفس میں بیٹھا ہے؟

گل میں چھپا ہے قیسِ حزیں، دیوا کوئی صحرا میں نہیں
پیغامِ جنوں جو لایا تھا، اقبال وہ اب دنیا میں نہیں

اے مطربِ تیرے ترانوں میں اگلی سی ادا باقی نہیں — وہ تازگیِ تخیل نہیں، جیسا فکر کی جدت نہیں
تو بھول گیا اپنے نغمے۔ کچھ فرق ترے گانوں میں نہیں — تاثیر جو دل پر کرتی تھی، وہ لے بھی تری تانوں میں نہیں
منزل وہ تری اُلفت کی گئی، اب عقل کی یہ کاری ہے — فرہاد کی بیتابی کے عوض، پرویز کی حیلہ سازی ہے
میں جسکا جویا ہوں گنجینہ میں تیرے گوہر وہ نہیں — سامانِ فریبِ عقل تو ہے، جو دل میں چبھے نشتر وہ نہیں

اس گلشن سے تجھکو نسبت، اب جز نگِ گلچیں نہ رہی
اب تیری زباں حق گو نہ رہی، اب تیری نظر حق بیں نہ رہی

تیرے جامِ دل کی مے اب کوثر میں تبدیل ہوئی — مذہب کے افسوں نے تری پاکیزہ تخیل بدلی
افسوس کہ تیری فکرِ فلک پیما کا یہ انجام ہوا — تو تو فردوس کا طائر تھا، کیوں آکے اسیرِ دام ہوا؟
تو وہ فطرت تھا جو اشکِ اربابِ نظر بن سکتا تھا — تو جا کے صنم میں کیوں بیٹھا؟ جب کہ یہی گھر بن سکتا تھا!
تیری تقدیر کو تو نہیں ہیں اب یہاں کے سوا جلوے ہی نہیں — جو نورِ دلِ انسان میں ہے، غافل تو نے دیکھا ہی نہیں

اب دنیا والوں کو ہندو کی نہ مسلم کی حاجت ہے
مذہب آئندہ نسلوں کا نوعِ انسان کی خدمت ہے

جسکو ایماں کہتا ہے تو، پردہ ہے تری نادانی کا — اللہ تو کیا ہے؟ ایک نام فقط جہلِ انسانی کا
اپنی کمزوری کا باعث، تعلیمِ یزداں اور تو کی ہے — انسان کی ترقی کی دشمن، تفریقِ رنگ و بو کی ہے

میرا بس ہو تو ہر مسجد سے، روئے زمین کو پاک کروں — ہر مندر کو مسمار کروں۔ ہر ایک کلیسا خاک کروں
مذہب کے مینا کے قابل اے رند تری صہبا ہی نہیں — پوشاک جو تو نے پہنی ہے۔ قامت پہ ترے زیبا ہی نہیں

آ محفل کو اپنا کر لے۔ دیرینہ طرز سخن سے پھر
ہر لب پہ دعا آتی ہے یہی۔ خورشید کفن سے چھو لے پھر

مرا خزانہ ص ۱۲۳

اقبال کے تتبع میں

ہندوستان

اے مقدس آریہ ورت اے مرے ہندوستان
اے مبارک سرزمین اے گلشن جنت نشان

ناز گیتی کو تھا کس طرح تیری ذات پر
خاک کو حاصل ہو تجھ سے رشک چرخ آسمان

خوش فضا منظر ترے اور جانفزا آب و ہوا
ایک فردوس نظر تو ایک قوت جسم و جان

تیری زرخیزی کی ڈھونڈے سے نہیں ملتی مثال
تو اکیلا اک طرف اور اک طرف سارا جہان

تیری تقدیس و بزرگی میں بھلا ہو کیا کلام
کر گئے اوتار تجھ میں آ کے بزم آرائیاں

تجھ میں گذرے کیسے کیسے فلسفی اور رشی
تجھ میں گذرے کیسے کیسے سورما اور پہلوان

تجھ میں کیسے کیسے راجہ ہو گئے اور راج نیتر
تجھ میں گذرے کیسے کیسے خسرو گیتی ستان

جسطرح سرتاج عالم تھے سری کرشن اور رام
تھے اشوک اور وکرماجیت ایسے ہی فخر جہان

گرچہ بیگم تھے لیکن تھے یگانوں سے سوا
بابر و اکبر کے ہیں نام آج تک ورد زبان

والمیکی اور کالیداس ہی تجھ میں نہ تھے
فیضی و خسرو پہ بھی ہے ناز تجھکو بیگمان

غار ایلورہ تری دانائیوں کی ہیں نظیر
تاج سے صناعیوں کا تیری پیدا ہے نشان

اب بھی ڈھاکہ اور کشمیر و بنارس تجھ میں ہیں
اب بھی بیدر اور پرنا میں ہیں باقی کاروان

الغرض کیا ہے نہیں جو تجھ میں ہاں ملتی نہیں
تیرے باشندوں کو پہلے کی طرح اب وہ شان

وائے غفلت ہمنے خود تجھکو کیا ہے پامال وہ
وائے قسمت ہم نہ سوچے آپ ہی سے ہو تو ہان

اسطرح ہوتے نہ ہم اندھے اگر اور سادہ لوح
آج ہوتا کیسے ہندوستان محتاج نان

فضا میں اب بھی ہو یہ ممکن ملک کے پھر جاگ جائیں
ہو اگر حامی سخاوت کا ہر اک سید و جوان

فضا تمن لکھنوی

اپریل وئی ۱۹۰۷ء

ترانۂ قومی

مرحبا اے خاکِ پاکِ کشورِ ہندوستان — یادگارِ عہدِ ماضی ہے ترا حسنِ جہان
کیسے کیسے اولیا گذرے اور قطبِ زمان — جنکے قدموں نے بنایا ہے تجھے جنت نشان
روشنی سے تیرے پھیلا ہے اُجالا ہر طرف
تیرا دنیا میں رہے بول بالا ہر طرف

کیوں نہ کہے تجھکو اک سرچشمۂ آبِ بقا — ہیں یہ آثار جو تیرے یہ تیرے گنجِ بے بہا
روز و شب نیرنگیاں تیری ہیں کیا کیا جاں فزا — کس قدر ہے روح پرور یہ تری آب و ہوا
گردشِ ایام سے گو ہیں یہ دن نازک کیے
ہر جگہ یادِ وطن ہے مایۂ عیش و سرور

تیرا لازم ہے کہ ہوں بیدار اہلِ علم و فن — ہو نہ غفلت جذبۂ ملت پرستی جوش زن
فلسفہ تیری ستائش کا ہو تا چرخِ کہن — اور تیرے جانثار رکھیں ہو لب پر یہ سخن
"مٹ نہیں سکتے کبھی تیرے اصولِ اتفاق"
کیوں نہ ہو اے ہند تجھکو وہ رہو کا اشتیاق

جبکہ جاری ہو زبانوں پر یہ کلمہ صبح و شام — نغمہ اے ہند ہے جو معجزِ نظام
یعنی صلح و آشتی کا دین ہم آپس میں بنا — مشکلیں آسان ہوں گی ہوں گے جب جاں کلام
رو نما جسکی بدولت جلوۂ امید ہو
دور ہو ظلمت نہ ہو اور گھر گھر عید ہو

دین و دنیا میں خدا سب کے مگر اے خاکِ ہند — گود میں تیری رہیں شیر و شکر اے خاکِ ہند
تیری خدمت پر جو باندھیں گے کمر اے خاکِ ہند — ہونگے وہ تیرے لیے سب سے گہر اے خاکِ ہند
زیب و زینت میں تو اے جانِ جہاں اے ہند ہے
خیر و برکت سے تو اے ہندوستاں معمور ہے

روز و شب قوموں کو ہوتی ہے ترقی یا زوال — کر سکا لیکن نہ تجھکو دور گردوں پائمال
ہر زمانے میں رہا تیرا عجب جاہ و جلال — سایۂ رحمت نے دائم تجھکو رکھا ہے نہال
گر نظر آئے کبھی غم کی گھٹا چھائی ہوئی
ٹل گئی سر سے تیرے ہر بلا آئی ہوئی

اختلاف دین و ملت کے یہ جھگڑے ہوں تمام — جو مصیبت بن گئے ہیں آج بہر خاص و عام
ہے مبارک جو تجھے حاصل ہے امن و انتظام — "با مسلمان اللہ اللہ با برہمن رام رام"
خاکساری میں تو اب تک شہرۂ آفاق ہے
مخزن فضل و ہنر ہے معدن اخلاق ہے

سفیر کاکوروی

ایک ہندوستانی لڑکے کا گیت

اے میری جان بھارت سیوا تری کرونگا — پرانون کے پران بھارت دکھڑی ترے ہرونگا
جب تک کہ دم مین دم ہی تیرا ہی دم بھرونگا — گر جان تک بھی جائے ہرگز نہ مین ڈرونگا
تیرے لئے جیونگا۔ تیرے لئے مرونگا

تو نے ہی مجھکو دی ہی یہ میری زندگانی — کھاتا ہون ناج تیرا۔ پیتا ہون تیرا پانی
شفقت ہی تیری مجھپر۔ تیری ہی مہربانی — بھارت یہ بات مین نے ہی اپنے دلمین کھانی
تیرے لئے جیون گا۔ تیرے لئے مرونگا

بھارت تری محبت میری خمیر مین ہے — اہل وطن کی اُلفت میری خمیر مین ہے
تیری گذشتہ عظمت میری خمیر مین ہے — تیری قسم! صداقت میری خمیر مین ہے
تیرے لئے جیونگا تیرے لئے مرونگا

کیون خرچ سفلہ پرور مجھکو مٹا رہا ہے — پیری مین اتنے صدمے مجھکو دکھا رہا ہے
کیون سوزِ غم مین ظالم مجھکو جلا رہا ہے — یہ درد آگ دلمین میرے لگا رہا ہے
تیرے لئے جیونگا۔ تیرے لئے مرونگا

علم و عمل کا جادہ یارب مجھے دکھانا — تو میری لاج رکھنا اور لاجپت بنانا
رستے پہ گو کھلے کے یارب مجھے چلانا — مجھکو یہ گیت گا کر بھارت کو ہے جگانا
تیرے لئے جیونگا۔ تیرے لئے مرونگا

یارب وہ دن بھی لانا جب مین جوان ہوکر — بھارت کے غم مین نکلون بے خانمان ہوکر
اپنے لئے دکھا دون بھارت کی شان ہوکر — گاتا پھرون ہر اک جا شیرین زبان ہوکر
تیرے لئے جیونگا۔ تیرے لئے مرونگا

آئیگی جو مصیبت ہنس کھیل کر سہونگا — خدمت مین تیری بھارت باندھے کمر رہونگا
تیرا غلام ہونگا۔ خدمتگذار ہون گا — کہتا ہون آپ بھی مجھ سے پھر بھی یہی کہونگا
تیرے لئے جیونگا۔ تیرے لئے مرونگا

تلوک چند محروم

اپنے وطن پہ صدقے

پنجتن جناب اقبال

پرتھی نے جاں گنوائی پیارا رتن سمجھ کر — رانا نے خوں سے سینچا اپنا چمن سمجھ کر
تل ہو گئے ہزاروں اسکو وطن سمجھ کر — ہم ہو گئے تصدق اپنا وطن سمجھ کر
اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

یونانیوں کو کس نے علم و ہنر سکھایا — تاتاریوں کو کس نے یوں آدمی بنایا
ایرانیوں کا کس نے آتشکدہ بجھایا — دنیا کو سیر حق کا کس نے سبق پڑھایا
اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

نے کرشن نے بجائی جس راز کی بیاں پر — گوتم کے وعظ میں تھا نانک کی تھا زباں پر
چشتی نے جس زمیں کو پہونچایا آسماں پر — کیونکر نہ سر جھکائیں ہم ایسے آستاں پر
اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

ہر گل میں ہے ابھی وہ خوشبوئے روح پرور — کرتی ہے اُن پہ شبنم اب تک نثار گوہر
کانٹوں پہ لوٹتے ہیں اب تک سنان و خنجر — موسم بتا رہے ہیں اب تک یہی گزر کر
اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

قدرت کی دلفریبی احسان کر رہی ہے — آئینہ بن کے کیا کیا حیران کر رہی ہے
ہمت ہماری ہمکو بے جان کر رہی ہے — غیرت یہی اشارہ ہر آن کر رہی ہے
اپنے وطن پہ صدقے اپنے وطن پہ صدقے

کلیم اعظم گڈھی

فروری ۱۹۳۰ء

تضمین

بر اشعار ڈاکٹر اقبال

چلتا ہے دور بادۂ عرفان بکام ہند — ہین واقف سرور ازل خاص و عام ہند
بالا ہے بزم پیر مغان مین مقام ہند — لب ریز ہے شراب حقیقت سے جام ہند
سب فلسفی ہین حلقۂ مغرب کے رام ہند

وہ ہند کے بلند خیالان باخبر — رہتی تھی جنکی ہفت سماوات پر نظر
دیکھے پڑے تھے سب نے حل و زہرہ و قمر — یہ ہندیون کی فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت مین آسمان سے بھی اونچا ہے بام ہند

دل کو نہ ہونے دیتے تھے شیدائے سنگ و خشت — سرگرم ہوا نہ ان سے کبھی کوئی فعل زشت
یہ خطہ اس زمانے مین تھا واقعی بہشت — اس دیس مین ہوئے ہین ہزارون ملک سرشت
مشہور جنکے دم سے ہے دنیا مین نام ہند

جس طرح ماہ و مہر پہ ہے آسمان کو ناز — اور نور پر ہے مہر و مہ صفوفشان کو ناز
جس طرح دُرّ و لعل پہ ہے بحر و کان کو ناز — ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہین اسکو امام ہند

پھیلی جو آکے شمع حقیقت کی روشنی — باطل کی راہ۔ راہ عدم ڈھونڈھنے لگی
مدت ہوئی مگر ہین ابھی جھلکیان وہی — اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے مین شام ہند

محروم

زمانہ جلد ۱۸ اپریل ۱۹۱۲ء

"ہندوستان"

ہر ملک تھا جہان مین افسانہ خوان ہمارا
ہوتا نہ تھا بتاؤ چرچا کہان ہمارا

پشمینہ سوت ریشم مشہور تھا یہان کا
اب اُنکے بدلے باقی ہے تار جان ہمارا

کمخاب سے یہان کے سونا تھا ہمکو ملتا
سستا سمجھ کے لیتے سوداگران ہمارا

کشمیر کے دوشالے دُنیا مین فرد نکلے
تھا صنعتون کا شایق پہلے جہان ہمارا

پتھر کی صنعتون مین یہ ملک تھا نمونہ
ملتا کہین کہین[1] ہے پچھلا نشان ہمارا

ہے زعفران ہمارا پھولونسے بڑھکے اب بھی
فصلِ بہار دیکھے رنگِ خزان ہمارا

کیا چیز ہے جہان کی پیدا نہین جو اسمین
دُنیا کا ہے خلاصہ ہندوستان ہمارا

سونے کی کانین اسمین قسمت جگا رہی ہین
لیکن سُلا رہا ہے خوابِ گران ہمارا

دریا یہان ہین بہتے ہم خشک لب ہین رہتے
ریگِ روان ہے ہمکو آبِ روان ہمارا

گر صنعتین یہان کی پھر زندہ ہون تو دیکھو
جی جائے پھر جہان مین یہ نیمجان ہمارا

کُشتہ ہوے تو کیا ہے تم پھر جلا لو ہمکو
مرنے سے بھی ہے آسان جینا یہان ہمارا

اے اشہری جہان مین ہم خاک ہو چکے ہین
اکسیر اب بنائے کُشتہ جہان ہمارا

اشہری

---

[1] دیکھو ایلورا اور اجنٹا کے غار اور خانقاہین اور معابد۔

پیغام درا

مولوی سید برکت علی صاحب "گوشہ نشین" رئیس فیروزپور (پنجاب) کے منظوم کا مجموعہ ہے جو تین حصوں پر مشتمل ہے یعنی صدائے درا، آوازِ درا اور زبورِ مشرق۔ ہر حصہ میں حمد، نعت، منقبت اور متعدد نظمیں ہیں۔ شروع میں بعض علماء و مجتہدین کی تقریظیں بھی ہیں اور مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی برکت علی صاحب دُنیا کا رنگ دیکھکر گوشہ نشین ہو گئے ہیں اور درویشانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

تمام نظمیں عموماً تاریخی، روایتی اور فرضی افسانے نظم کئے گئے ہیں جنکا مقصد ہے ناظرین و سامعین کو نصیحت کرنا، اور اسلئے پوری کتاب کو ایک درس خشک یا مولویانہ وعظ کہا جا سکتا ہے۔

اصول شاعری کو مدِ نظر رکھکر پیغام درا پر تنقید کرنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس قسم کی نظمیں کہنے والے کو

سلہ چھوٹی تقطیع حجم ۲۸۰ صفحات قیمت ۱۰ ملنے کا پتہ مصنف

شاعری سے چندان غرض نہین ہوتی بلکہ اپنا خیال ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن تعجب ہوتا ہے جب ہم جابجا مصنف کی زبان سے نعرۂ انانیت بلند ہوتے ہوئے سُنتے ہین۔ مثلاً صفحہ ۲۳۶ "ندائے غیب"

ایمان کا مرقع ہے عمل کی یہ ہے تصویر — پیغام در اگویا ہے قرآن کی تفسیر
کہدے یہ مقوس کو کوئی میری طرف سے — ہے کیمیا یہ اور یہی نسخۂ اکسیر

لطف یہ ہے کہ اس مجموعہ مین بہت سے اشعار موزونیت اور محاسن صوری و معنوی سے آزاد ہین، جابجا غزلین بھی ہین مگر نام کی اوطعین بھی وہی رنگ ہے جو پوری کتاب مین ہے۔

طمانچو نہر طمانچے موج دریا کے جو کھاتے ہین — وہی اک روز آخر گوہر شاہوار پاتے ہین
بُری صحبت مین جو ملکر گنوا دیتے ہین عزت کو — بڑونکے نام پر بٹہ ہی جاہل لگاتے ہین

نظم کے ذریعہ سے مولانا حالی پانی پتی مرحوم اور مولانا اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی اصلاح قومی کا فرض ادا کیا ہے مگر اہل نظر دیکھ سکتے ہین کہ ان بزرگان قوم اور گوشہ نشین صاحب کے کلام مین وہی مناسبت ہے جو آسمان اور زمین مین۔ کتابت و طباعت معمولی ہے اور کتابت مین غلطیان بکثرت موجود ہین۔

اقبال کی نثری تصانیف کا جائزہ

علم الاقتصاد

پروفیسر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے کی نو تالیف کتاب "علم الاقتصاد" جو پولیٹیکل اکانمی کے اصول پر مدوّن ہوئی ہے ہمارے سوشل رفارم کے لیے ایک زبردست تقویت خیال کیجائے گی۔ شیخ صاحب لاہور کے گورنمنٹ کالج مین نہایت مُبرز اور فلسفہ کے پروفیسر ہین۔ لہذا تمدّنی مذاق کے متعلق اگر انکی تصنیف غیر معمولی خوبیون کا مجموعہ ہو تو زیادہ تعجب کی بات نہین۔ یہ وہ خیالات ہین جو مدت سے اُنکے دماغ مین جمع ہو رہے تھے اور جنکا علمی حلقون مین غیر معمولی خیر مقدم کیا جائیگا۔ خصوصًا اصلاح تمدن کے حامیون کو اس تصنیف سے عمدہ مدد ملسکتی ہے۔ اقتصاد انسانی تمدن کا جزء اعظم ہے اور قدیم کتب اخلاق مین بھی جا بجا اسپر زور دیا گیا ہے۔ لیکن حق یہ ہے کہ جسطرح آج زمانۂ قدیم کی معمولی سی معمولی باتون کو ایک وسیع علم بنا دیا گیا ہے۔ وہ اسی زمانے کا حصہ ہے یہ کتاب بتاتی ہے کہ دولت کی پیدایش۔ تقسیم۔ تبادلہ۔ اور استعمال کے اصول کیا کیا ہین۔ درحقیقت یہ اصول نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہین اور نہایت سنجیدہ استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ ملک کو اپنی اقتصادی حالت درست کرنے کی جسقدر سخت ضرورت ہے وہ محتاج تصریح نہین۔ ہم خوش ہین کہ علم الاقتصاد کی اشاعت بہت ہی مناسب وقت پر ہوئی ہے اور اُمید کرتے ہین کہ ذی استعداد مصنف کی دماغ سوزی رایگان نجائیگی جسطرح یہ علوم اُردو زبان مین بالکل نئے ہین اُسی طرح یہ تصنیف بھی اُس عظیم الشان سلسلے کی پہلی جلد ہے جو کئی ضخیم جلدون مین ختم ہوگا۔ ملک کو اُس وقت کا دلچسپی کے ساتھ منتظر رہنا چاہیے جب شیخ صاحب اس سلسلے کو تکمیل تک پہونچائین۔ تاہم خیال رکھنا چاہیے کہ یہ کوئی ناتمام کتاب نہین ہے، بلکہ فاضل مصنف نے جس مسئلے کو اُٹھایا ہے اُسے اس کتاب مین کامیابی کے ساتھ ختم کر دیا ہے۔

زمانہ فروری ۱۹۰۵ء

تنقید

علم الاقتصاد[1]

مصنفہ شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے۔

اُن علوم جدید مین جنکے ایجاد اور ترتیب کا فخر اہل فرنگ کو حاصل ہے علم سیاست مدن (Political Economy) کا پایہ عالی ہے فرنگستان کی موجودہ سطوت بہت کچھ تجارتی اور حرفتی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اور فرنگستان کی تجارت وحرفت پر مختلف زمانون مین مختلف اصول سیاست مدن کا بین اثر پڑا ہے۔ اب چونکہ ہندوستان نے بھی گوشۂ تنہائی سے نکلکر کشاکش حیات کے میدان مین قدم رکھا ہے ہمان اسکو اپنی قومی زندگی کی حفاظت کے لیے ایسے اقوام سے مقابلہ کرنا ہے جو سیاست مدن کے اصولون کو بہت اچھی طرح سمجھے ہوئے ہین اور تجارتی اور حرفتی اسلحہ سے پوری طرح آراستہ ہین اس لیے ہمارے اہل وطن کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ علم دولت کے اصولون سے ماہر ہوکر اپنے کو انکے مقابلے کے قابل بنائین۔ شیخ محمد اقبال صاحب نے بھی اس ضرورت کا ذکر اپنے دیباچہ مین کیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ "بالخصوص اہل ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہان مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے ہمارا ملک کامل تعلیم نہونے کی وجہ سے

[1] مطبوعہ پیسہ اخبار اسٹیم پریس لاہور قیمت عہ۔

اپنی کمزوریون اور نیز اُن تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جنکا جاننا قومی
فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد
ہے کہ جو قومین اپنی تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہین انکا حشر کیا ہوا
ہے ابھی حال مین مہاراجہ بروده نے اپنی ایک گران بہا تقریر مین فرمایا تھا کہ
اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریون کا آخری نسخہ ہے
اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے پس اگر اہل ہندوستان
دفتر اقوام مین اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہین تو انکے لیے ضروری ہے کہ وہ اس
اہم علم کے اصولون سے آگاہی حاصل کرکے معلوم کرین کہ وہ کون سے اسباب
ہین جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہین۔

جہانتک ہمکو معلوم ہے شیخ محمد اقبال صاحب کی کتاب اُردو مین اپنے
ڈھنگ کی پہلے کتاب ہے علم دولت کے متعلق ایک دو کتابین تراجم کی
حیثیت سے اسکے قبل شائع ہو چکی ہین مگر جس صراحت کے ساتھ علم سیاست ان
کے ہر پہلو پر شیخ محمد اقبال صاحب نے اس کتاب مین بحث کی ہے اور جس
عمدگی کے ساتھ انھون نے مضامین کو ترتیب دیا ہے وہ دوسرے نامکمل
نسخون مین نظر نہین آتی۔ شیخ صاحب نے اصول سیاست مدن انگریزی
کتب سے اخذ کرکے بیان کیے ہین اور کہین کہین ہندوستان کی مثال پیش نظر
رکھکر ان اصولون کے طریق عمل کو سمجھایا ہے زبان یون تو صاف ہے مگر علمی
اصطلاحات کچھ تو شیخ صاحب نے خود وضع کیے ہین اور کچھ مصر کے عربی
اخبارات سے لیے ہین اور گو بعض اصطلاحات نئے ہونے کی وجہ سے
کانون کو بھلے نہین معلوم ہوتے تاہم ان دقتون کو مد نظر رکھکر جنکا پیش آنا
سیاست مدن ایسے نئے اور دقیق علم کے بیان مین ضروری ہے ہم کہہ سکتے
ہین کہ شیخ محمد اقبال صاحب "اقتصادی اصول کے مفہوم کو واضح کرنے مین"
بہت کچھ کامیاب ہوئے ہین۔

تحفظ تجارت (Protection) کے معاملے مین شیخ
محمد اقبال صاحب رانا ڈے مرحوم اور مسٹر جی سلبر مینا آئر کے ہمزبان ہین

ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

زمین کے اس خاصے کے بنا پر بعض لوگ کہتے ہین ہندوستان چونکہ صنعتی ملک نہین ہے اس لیے یہ غیر ممالک کے لیے ایک قسم کا ذخیرہ بن گیا ہے جہان سے وہ اپنے صنعتی کارخانون کیلیے مصالح حاصل کرتے ہین اور پھر اس مصالح کو اپنی دستکاری کے عمل سے نئی نئی مصنوعات کی صورت مین تبدیل کرکے دیگر ممالک اور ہندوستان مین بھیجکر بے انتہا فائدہ اُٹھاتے ہین۔ ہمارے ملک مین چونکہ قانون تعقیل کے روکنے کے اسباب بہت قلیل ہین لہذا جو اشیاء ہندوستان مین دیگر ممالک سے آتی ہین ان پر قانوناً بہت سا محصول لگنا چاہیئے جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دیگر ممالک کے تاجر اپنے صنعتی اشیاء اس ملک مین نہ بیچ سکینگے اور اگر بیچین گے تو اُنکو کچھ فائدے کی توقع نہ ہوگی۔ کیونکہ زیادہ محصول کی وجہ سے ان اشیاء کی قیمت گران ہوجائیگی اور یہان کے لوگ ان کو خریدنے سے باز رہین گے۔ اس طرح ہمکو اپنی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے خود اپنا محتاج ہونا پڑیگا اور ہماری صنعت کو ترقی ہوگی۔ اس طریق عمل کو حفاظت تجارت یا تامین تجارت کے نام سے موسوم کرتے ہین"

مگر آپ نے اس اصول کو عمل کا کچھ ذکر نہین کیا۔ برٹش گورنمنٹ انگریزی تاجرونکے ڈر سے ہندوستانی صنعت و حرفت کے محافظت سے گریز کرتی ہے۔ مسٹر دت نے اپنی تاریخ مین ان مظالم کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جو گذشتہ صدی مین ہندوستانی حرفت پر اہل انگلستان کے ہاتھون سے ہوئے ہین اور جنھون نے کلوں کی قوت اور ہمارے اہل ملک کی پست ہمتی سے مدد پاکر ہندوستان کی تجارت اور حرفت کا ستیاناس کردیا۔ ایسی حالت مین کیا ہندوستانیون کا فرض نہین ہے کہ جہانتک اُنسے ممکن ہو اپنی حرفت کی محافظت آپ کرین:

اکسچینج (Exchange) کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے بھی آپ نے بہت اختصار سے کام لیا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس اہم مسئلہ کا

ایک پہلو بالکل فروگذاشت ہوگیا ہے۔ شیخ صاحب کا یہ کہنا کہ "چونکہ انگلستان
کے مصارف ہمکو پونڈون مین ادا کرنے پڑتے ہین اسواسطے چاندی کی قدر مین
تنزل آجانے کی وجہ سے ہمین اور بھی نقصان ہوا کرتا تھا لیکن اب اجرائے
سکہ طلائی کے باعث اس مشکل کا اندیشہ نہین رہا" صحیح ہے مگر اسی کے
ساتھ یہ بھی تو خیال کرنا چاہیے کہ پونڈ کی مصنوعی قیمت مقرر کرکے سرکار دولتمدار
نے ہندوستانی اشیاء کی قیمت زبردستی گھٹا دی ہے فرض کرو کہ ایک من گیہون
کی قیمت انگلستان مین ایک پونڈ ہے اگر سرکار نے قانوناً پونڈ کی قیمت محدود
نہ کردی ہوتی تو شاید اسوقت بڑھتے بڑھتے اس کی قیمت سترہ یا اٹھارہ روپیہ
تک پہونچگئی ہوتی اور ہندوستان کا شتکار کو ایک من گیہون کے عوض مین
بجائے پندرہ کے سترہ یا اٹھارہ روپیہ ملتے۔ ہم یہ نہین کہتے کہ ایکسچینج کے
استقلال سے کچھ فائدہ نہین ہوا مگر جب اس قانون کا ذکر کیا تھا تو اسکے نقصان
وفوائد دونون پر نظر ڈالنی تھی۔

ہمکو یہ دیکھکر سخت تعجب ہوا کہ شیخ محمد اقبال صاحب کو اس رائے سے
اختلاف ہے کہ "رقم مالگذاری کا دوامی طور پر مقرر کردیا جانا لوگون مین قحط کا مقابلہ
کرسکنے کی قابلیت پیدا کردیگا" شیخ صاحب کو اس سے تو اقرار ہے کہ حق ملکیت
ایک اکسیر ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتا ہے پھر اس بات کے سمجھنے مین کیا قباحت
ہے کہ جب زمیندار کے دل سے یہ وسوسہ دور ہوجاویگا۔ اور اسکو یقین ہوجاویگا
کہ اسکی دولت اور اسکی محنت کا ثمرہ اس سے چند روز بعد چھین نہین لیا جائیگا
تو وہ زمین کی پیداوار کے بڑھانے اور اسکو زیادہ زرخیز بنانے مین مزید کوشش
کریگا۔ ہر بیس یا تیس برس کے بعد اگر اضافہ مالگذاری نہ ہوا کرے تو زمیندار
وکاشتکار کا وہ افلاس جسمین وہ مالگذاری کی سختی کیوجہ سے آئے دن گرفتار
رہتے ہین کچھ ضرور کم ہوجائے گا۔ ہندوستان کا قحط غلہ کا قحط نہین ہوتا بلکہ پیسہ
کا قحط ہوتا ہے۔ عوام افلاس کی عالمگیر بلا مین ایسے مبتلا ہین کہ انکے پاس
اتنا اندوختہ بھی نہین کہ وہ ایک سال کی گرانی اسکی مدد سے جھیل سکین افلاس
کے وجوہات پر بحث کرنے کا یہ محل نہین ہے ہمکو صرف اسقدر دکھلانا منظور ہے

کہ ہندوستان مین غیر قوم کی حکومت ہونے کی وجہ سے اقتصادی اصول اپنا اثر
آزادی کے ساتھ نہین پیدا کر سکتے۔ تعلیمی مسائل کی طرح اقتصادی مسائل پر
بھی ہمارے ملک مین پولٹیکل رنگ چڑھ جاتا ہے اور اقتصادی ترقی کی راستہ
مین بیسون پولٹیکل رکاوٹین پیدا ہو جاتی ہین اسی وجہ سے تو ہندوستان کو
برٹش گورنمنٹ کے سایۂ عاطفت مین رہکر پولٹیکل آزادی کی سخت ضرورت ہے

••

زمانہ مئی ۱۹۰۵ء

مجموعۂ کلام پر تبصرے

بانگ درا۔ ڈاکٹر اقبال ہندوستان کا وہ عالی دماغ شاعر ہے جسکی شہرت مغربی ساحل سے گزر کر سات سمندر پار یورپ تک پہنچ چکی ہے یہ ڈاکٹر صاحب کے اُردو کلام کا مجموعہ ہے جو گزشتہ چند سال کے دوران مین کئی بار طبع ہو کر ہاتھون ہاتھ فروخت ہو چکا ہے۔ یہ مجموعہ جب پہلی بار چھپا تھا تو اسکی قیمت پانچ روپیہ تھی۔ چونکہ بعض کم مایہ اہل ذوق اس قیمت مین خرید نہین سکتے تھے اس لیے دوسرے ایڈیشن مین اسکی قیمت نصف کر دی گئی تاکہ قدردانانِ کلام اقبال اسکے مطالعے سے مستفید ہو سکین۔

زیر نظر مجموعہ شیخ مبارک علی صاحب نے شائع کیا ہے جو ظاہر مین سابق ایڈیشنون سے زیادہ دیدہ زیب اور نظر فریب ہے معنوی خوبیون کا اعادہ تحصیل حاصل ہے۔ کیونکہ یہ مجموعہ ملک مین کافی شہرت اور قبولیت حاصل کر چکا ہے۔ جن حضرات نے اب تک "بانگ درا" کا مطالعہ نہین کیا ہے اُن کو یہ جدید ایڈیشن شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور سے منگانا چاہیے۔

زمانہ مارچ ۱۹۲۹ء

پیامِ مشرق

از ڈاکٹر اقبال۔ مطبوعہ شیخ مبارک علی۔ تاجر کتب۔ انارکلی لاہور۔ قیمت۔ سے۔

یہ وہی مشہور مجموعۂ منظومات ہے جو اب سے پہلے شائع ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکا ہے ڈاکٹر اقبال کی شیدا نہ موشگافیاں، دلکش اندازِ بیان اور حکیمانہ مواعظ مشہورِ زمانہ ہیں اور ان پر تبصرہ کرنا تحصیلِ حاصل سے زیادہ نہیں۔ البتہ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے "دیوانِ مغرب" کے جواب میں "پیامِ مشرق" پیش کیا گیا ہے اور دراصل مشرق کا یہ پیام اہلِ مغرب کے لئے ایک بہترین تحفہ ہونے کے ساتھ ہی حکمتِ مشرق کا ایک دریائے مواج ہے جسکی تہ میں دُرِ ہائے شاہوار پوشیدہ ہیں اور مشرق و مغرب دونوں کے لئے سبق آموز ہے۔ شیخ مبارک علی صاحب نے اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر بہت حسن و خوبی اسکو شائع کیا ہے۔ جو حضرات فارسی زبان کا مذاق رکھتے ہیں انکو "پیامِ مشرق" ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

اپریل ۱۹۳۰ء

کلامِ اقبال-۱

اقبال کی یہ نظم کرنل بھولا ناتھ، عبدالواجد ندوی اور اقبال کے مابین مباحثہ کا ہدف بنی تھی، اس لئے یہاں تو مباحثہ کا حصہ ہے۔ تاہم مستقل بالذات حیثیت سے ''کلام اقبال-۲'' کے تحت بھی درج کی جارہی ہے۔ (ش)

نصیب ما ز جہان بقدر ہمت ما

پیچ می دانی کہ صورت بندِ ہستی با فرانس
فکر رنگین و دل گرم و شراب ناب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستان سپرد
جرمنی را چشم حیران و دل بیتاب داد

روس را سرمایہ جمعیت ملت ربود
قہر او کوہ گران را لرزۂ سیماب داد

تا بر انگیزد فضائے حریت از ساز دہر
صدر جمہوریۂ امریکہ را مضراب داد

ہر کسے در خورد فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے نبود و خویش را با ما سپرد

اقبال

جنوری ۱۹۱۹ء

مراسلت

جناب اڈیٹر صاحب۔

جنوری کے زمانہ میں کلام اقبال کے عنوان سے چند فارسی اشعار درج تھے جو میری نظر سے گذرے ڈاکٹر اقبال کی اُردو شاعری میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ باوجود اہل زبان نہونے کے آپ کی شستہ زبان اور جدت خیالات پر ہم اہل پنجاب جتنا بھی ناز کریں بجا ہے۔

بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے دوست اپنے سمند خوشخرام کا جولان اُردو کے میدان ہی میں محدود رکھتے۔ فارس کی زمین سنگلاخ پر آپ کا اسپ تازی ناخون لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

ان پانچ شعروں میں عروض اور محاورہ کسی جگہ پر سقیم ہے۔ مثلاً

(۱) صورت بند محاورہ نہیں۔ صورتگر۔ یا صورت آرا کہتے ہیں بند کیساتھ نقشبند ہوا کرتا ہے۔

(۲) یا فرائض سے مراد آپ کی فرائض را کی ہے۔

یہ فرائض کے معنی فرائض را کے ہو سکتے ہیں۔ با کے معنی ہمراہ یا بعد کے ہوا کرتے ہیں۔

(۳) ایرانی فرانس کو فرنہ کہتے ہیں فرانس نہیں کہتے اور تقطیع میں ف متحرک پڑتی ہے جو صحیح نہیں۔

(۴) نگہ رنگین نہیں ہوتا طبع رنگین محاورہ ہے۔

(۵) دل گرم نہیں ہوتا۔ دل نرم۔ دل شاد و خورم اور سرد دل البتہ مستعمل ہے۔

(۶) چشم حیران کی جگہ پر سرگران بمعنی نخوت و تکبر زیادہ موزوں ہے۔

(۷) نوا کی بجائے صدا ہونا چاہیے۔ ساز میں سے صدا نکلتی ہے نہ نوا۔

(۸) امریکہ کی تقطیع میں امریکیہ آتا ہے۔

(۹) میں شاعر نہیں البتہ شعر پڑھنے کا شوق رکھتا ہوں۔ اسلیے جو ذہن میں آیا بے تکلف عرض کیا۔

بھولا ناتھ

لفٹننٹ کرنل مارچ ۱۹۱۹ء

نصیب ما ز جہان شد بقدر ہمت ما

صورت آرائے ازل دانی فرنسہ را چہ داد
طبع رنگین و دل شاد و شراب ناب داد

ملک و تدبیر و تجارت را بانگلستان سپرد
جرمنی را سرگران داد و دل بیتاب داد

روس را شیرازۂ جمعیتش از ہم گسیخت
نمسہ و بلغاریہ را لرزۂ سیماب داد

اٹلی و یونان را در عہد نازا اتحاد
شاہ جاپان بزلف چین بہر تاب داد

کردۂ پرتگالیہ را جام مے از پرتغال
مرزۂ ہالند را از چشم قیصر آب داد

تار قے را قوت جانش در دل ماہی نہاد
زہر بر سوید را ہم قاتم و سنجاب داد

تا برانگیزد صدائے حریت از ساز دہر
صدر جمہوریۂ امریک را مضراب داد

تاجداران را گدا کرد و گدا را تاجدار
اوج و پستی جہان را گردش دولاب داد

پیش ہر یک بہرۂ از خوان الوانش نہاد
ہند را بہر تماشہ چشم دو پر آب داد

بھولا ناتھ
لفٹننٹ کرنل آئی۔ ایم۔ ایس

مُباحثہ

ڈاکٹر اقبال و کرنیل بھولاناتھ

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔

آپ کے رسالہ کی فروری نمبر مین لفٹننٹ کرنل بھولاناتھ صاحب کی مراسلت میری نظر سے گذری۔ غلطی ہر فرد بشر سے ممکن ہے۔ اِس باب مین متقدمین متاخرین، اہل زبان غیر اہل زبان، فارسی گو اور ریختہ گو سب ایک سطح پر ہین۔ اس انسانی کمزوری کا علاج صحیح اور بے لاگ تنقید ہے۔ صحیح تنقید ہی وہ آئنہ ہے جسمین شاہد سخن کا ایک ایک خط و خال صاف صاف نظر آتا ہے۔ عام ناظرین پڑھتے ہین۔ نازک اور دلفریب اداؤن سے واقف ہوتے ہین اور کمال فن کی داد دیتے ہین۔ خود شاعر دیکھتا ہے تو اُسے اپنے جوہر کمال کے پہلو بہ پہلو اپنے نقائص بھی بے نقاب نظر آتے ہین (اگر طلب کمال کا شوق ہے تو) اپنے جوہر کو اور چمکاتا ہے اور نقائص کی اصلاح کرتا ہے۔ عہد مغلیہ مین ایران کے شعرا نے ہندوستان مین آکے جو ترقی کی وہ اُنکو خود ایران مین حاصل نہوئی۔ اسکا اصلی راز یہ ہے کہ اِس زمانہ مین ہندوستان کے سلاطین و امرا رفیاض و فن پرور ہونے کے ساتھ خود اہل نظر اور جوہر شناس بھی ہوتے تھے۔ اپنی صحیح نکتہ چینیون سے ذی استعداد شعرا کے جوہر چمکاتے اور اُنکی خامیان دور کرتے تھے۔ عرفی، نظیری، صائب، کلیم فارسی شاعری خصوصاً غزل گوئی کے مہر و ماہ ہین۔ لیکن اُنکے اس کمال سخن نے مغلیہ سلاطین و امرا کے دامن تنقید مین پرورش پائی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے آج حالت برعکس ہے۔ سلاطین، امرا، جمہور سب سے مذاق سلیم رخصت ہو چکا ہے۔ اگر کوئی شاعر شہرت کے منظر عام پر آچکا ہے تو اُسکا ادنیٰ و اعلیٰ رطب و یابس ہر قسم کا کلام یکسان شوق و ذوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور اگر کوئی

خوشگو شاعر بدقسمتی سے گوشۂ گمنامی میں پڑا ہوا ہے تو اُسکے عمدہ سے عمدہ اشعار کی داد دینے والا نہیں ملتا۔

ڈاکٹر اقبال شہرت کی حد سے گزر کے "ترجمان قوم" کے درجہ تک پہونچ چکے ہیں اسلیے بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو انکے کلام کی حرفگیری ناگوار معلوم ہو لیکن اگر پہلے انکے کلام کی آزاد تنقید ضروری تھی تو اب بھی ازبس ضروری ہے۔ کیونکہ کامل سے کامل استاد بھی نقص و خطا سے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ درحقیقت کسی شے کا "انسانی" ہونا ہی اسکے "بیعیب" نہ ہونے کی دلیل ہے۔ کرنل بھولا ناتھ صاحب اقبال کی ایک فارسی نظم میں بعض فروگذاشتیں دکھانا چاہتے ہیں مگر مجھے انکی اردو شاعری میں اس قسم کی دو کمزوریاں اُنکا انتظار کرتی ہیں "ترانہ" اور "شکوہ" انکی شاعری کا واسطۃ العقد ہیں لیکن کیا انکا دامن شہرت اغلاط کے داغ سے پاک ہے؟

اگرچہ اُنکے آفتاب کمال کے داغ ہیں چاند میں بھی داغ ہیں مگر ان داغوں کی وجہ سے اسکے جمال جہاں آرا سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کی شعر موسم طبیعت سے نمایاں ہوتی ہیں اور اردو اور فارسی دونوں میں ہوتی ہیں مگر ان غلطیوں کی وجہ سے میں کو [illegible] صاحب کے ہم آہنگ ہو کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ بہت ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے [illegible] اقبال اپنے سحر خوشخرام کا جولان اردو ہی کے میدان میں محدود رکھتے۔ فارسی کی زمین [illegible] زین زیب کا اسپ تازی تازیانہ لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ طبع اقبال [illegible] خوشخرامی سے دونوں میدانوں کو محشرستان خیال بنا دیا ہے [illegible] "اسرار خودی" اسکے شاہد عدل ہیں۔ غالباً اسرار خودی کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ پروفیسر نکلسن لیکچر کیمبرج یونیورسٹی اسکا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں۔ اور یہ تو [illegible] واقعہ ہے کہ ایک صحبت میں "اسرار خودی" پڑھی جا رہی تھی۔ پروفیسر محمد کاظم شیرازی جو خاص ایرانی ہیں اور مغربی زبانوں میں سے انگریزی اور فرانسیسی سے واقف [illegible] اشعار سُن کر جھومتے تھے اور کہتے تھے کہ کاش یہ شاعر ایران میں پیدا ہوتا [illegible] پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب "پرسیا [illegible]

پرنیری آف ناڈرن پرشیا" میں جدید شاعری کے عمدہ عمدہ نمونے درج کیے ہیں۔ انکا انتخاب
اقبال کی مذکورہ دونوں مثنویوں سے کیجیے اور انصاف کیجیے کہ "فارسی کی زمین سنگلاخ ہے" یا
"اسپ تازی" ایران کے سنگ خوشخرام سے پہلو مارتا ہوا جا رہا ہے یا نہیں۔

تاہم کرنیل بھولا ناتھ صاحب کا یہ مراسلہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کم از کم کرنیل صاحب کی
اخلاقی جرأت اور صاف گوئی کی ضرور داد دینا چاہیے۔ کرنیل صاحب فرماتے ہیں کہ میں شاعر
نہیں۔ ممکن ہے یہ ایشیائی انکسار ہو لیکن اگر یہ واقعہ ہے تو آپ کے شوق سخن اور ذوق سلیم
کی داد دینا ظلم ہے۔ آپ نے اقبال کی نظم میں اصلاح دی ہے اور از راہ عنایت وہ
اصلاح اپنے مراسلہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اجازت دیجیے کہ دونوں کے متعلق کچھ عرض کروں۔

(۱) اقبال کے پہلے شعر کے مصرع اول پر کرنیل بھولا ناتھ صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ یہ اعتراض
[illegible] کرنیل صاحب لکھتے ہیں اچھا اعتراض فرماتے ہیں پہلا اعتراض یہ ہے کہ [illegible]
[illegible] ہیں ... بند کے ساتھ نقشبند ہو اکرتا ہے" مگر واقعہ یہ ہے کہ نقشبند کی [illegible]
[illegible] بند بھی محاورہ ہے۔ لغت کی متداول اور مستند کتابوں کی تصریح موجود [illegible]
[illegible] فرماتے ہیں۔

منظرے بوس کشیدہ بلند ٭ چشم بد دور صورت مند

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ با فراش بمعنی فراش رائے صحیح نہیں۔ یہ اعتراض پڑھ کے
میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ با کا رائے معنی میں آنا اسقدر مشہور و معروف بات ہے
کہ لغات و قواعد کی مشہور و مستند بلکہ معمولی سا درسی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ یہ مصرع
سند اعرض ہے۔

سنجاب دہ زمیغ با کوہ

تیسرا اعتراض لفظ فراش پر ہے۔ اس اعتراض کے دو جزو ہیں جزو اول کا
تعلق لفظ سے ہے اور جزو دوم کا تعلق وزن سے۔ اعتراض کے جزو اول سے تفریس
[illegible] اصولی بحث پیدا ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انیسویں صدی میں فارسی بولنے والے ممالک پر مغربی تہذیب کا

اثر پڑنا شروع ہوا۔ ہندوستان سیاسی اور علمی دونوں حیثیتوں سے انگلستان کے زیر اثر رہا۔ ایران سیاسی حیثیت سے تو انگلستان اور اس کے زیر اثر رہا مگر علمی حیثیت سے فرانس کا اثر قبول کیا۔ وسط ایشیا علمی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے اس کے زیر اثر رہا۔ اور فرانس کا اثر اگر پڑا بھی تو اسکی وساطت سے۔ اسلئے مغربی ناموں کا تلفظ ہر ملک نے الگ الگ کیا۔ ہندوستان میں چونکہ یہ نام انگریزوں کی وساطت سے آئے تھے، اسلئے تلفظ انگریزی کے قاعدہ سے کیا گیا۔ ایران میں یہ نام فرانسیسی زبان سے گئے تھے اسلئے اون کا تلفظ فرانسیسی تلفظ کے مطابق کیا گیا۔

لہذا وسط ایشیا میں ان ناموں کا تلفظ اسی قاعدہ سے کیا گیا۔ یہ تو ایک اصولی تمہید تھی۔ اب لفظ فرانس کو لیجئے۔ انگریزی میں تو اس کا تلفظ فرانس ہے جو لعبیشہ اردو میں قائم ہے۔ فرانسیسی میں اس کا تلفظ فرانسے اور فران کے بین بین ہوتا ہے جو غیر فرانسیسی کام زبان سے بغیر مشق کے مشکل ادا ہوتا ہے۔ اسلئے اگر ایرانی فرانس کو فرانسے کہتے ہیں تو یہ تعریب ہے اور نہ کوئی مستقل نام ہے۔ درحقیقت اختلاف تلفظ ہے جو درحقیقت انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے اختلاف تلفظ کا نتیجہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب مغربی نام فارسی زبان میں استعمال کئے جائیں تو انکو مفرس بنا لینا چاہیئے یا اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا چاہیئے۔ اور اگر مفرس بنایا جائے تو کس قاعدہ سے؟ مگر واقعہ یہ ہے کہ اسکے متعلق کوئی اصول اب تک طے نہیں ہوا ہے۔ ایرانی ارباب قلم عام قدرتی طریقہ کے پابند ہیں جس نے جو لفظ سنا ہے اسی طرح استعمال کرتا ہے مثلاً کلکتہ جب تک فارسی اخبارات خود ایران یا ایرانیوں نے نکالے تھے انمیں مغربی ناموں کا تلفظ انگریزی قاعدہ سے ہوتا تھا۔ ترکستان مثلاً پانچ صراحت وغیرہ سے جو فارسی اخبار نکلتے تھے انمیں مغربی ناموں کا تلفظ اسی قاعدہ سے ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال بھی اس عام قدرتی قاعدہ کے پابند ہیں۔ کرنل صاحب اس روش کو قابل اعتراض فرماتے ہیں۔ یہ درحقیقت محاورہ و زبان کی غلطی نہیں بلکہ اختلاف رائے ہے۔ لیکن ایک عجیب بات ہے کہ کرنل صاحب جس طریقہ کو پسند نہیں فرماتے خود اسی پر عمل کرتے ہیں۔ ایرانی نگر

فرانس کو فرانسہ کہتے ہیں تو جرمنی کو المانیا۔ اٹلی کو اطالیا، جاپان کو ژاپون کہتے ہیں۔ مگر کرنیل صاحب نے اپنی اصلاح میں ان تمام ناموں کا وہی تلفظ کیا ہے جو ہندوستان میں رائج ہے۔

پہلے شعر کے مصرعۂ ثانی کے متعلق کرنیل صاحب کا یہ ارشاد ہے کہ فکر رنگین اور دل گرم محاورہ نہیں۔ کیا عرض کروں اسوقت کوئی شعر یاد نہیں آتا۔ تاہم کرنیل صاحب اتنا تو ضرور تسلیم فرمائینگے کہ خیال رنگین اور رنگین خیال نیز گرم دل یعنی عاشق سوختہ آتا ہے۔ کیا اسکے بعد بھی فکر رنگین اور دل گرم یعنی سوختہ عشق غلط ہوگا مگر بہتر یہ ہے کہ یہ اعتراض سند کے ملنے تک ملتوی رکھا جائے۔ اسلئے اسوقت صرف اس سرسری اشارہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۲) اقبال کے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں کرنیل صاحب چشم حیران کے بدلہ سرگران زیادہ موزون خیال فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ موزونیت شاعری کے لحاظ سے ہے یا واقعہ کے خیال سے۔ شاعری کے لحاظ سے تو دل بیتاب کے لئے چشم حیران ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ رہا واقعہ تو اسکے متعلق وہ حضرات فیصلہ کر سکتے ہیں جو جرمن قوم کے اصلی کیریکٹر سے واقف ہیں۔ لیکن اگر واقعہ کے لحاظ سے سرگران زیادہ موزون ہے جب بھی سرگران چنداں مناسب نہ ہوگا کیونکہ سرگران کے معنی بقول کرنیل صاحب متکبر اور مغرور ہونگے۔ اور آگے داد ہے۔ اسلئے سرگرانی ہونا چاہیئے۔

(۳) چوتھے شعر کے پہلے مصرعہ پر یہ اعتراض ہے کہ "ساز سے صدا نکلتی ہے نہ کہ نوا" اسلئے نوا کے بجائے صدا ہونا چاہیئے"۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ نوا مطلق آواز کو بھی کہتے ہیں اور نغمہ کو بھی۔ موسیقی کے بارہ مقاموں میں سے ایک مقام کا نام بھی ہے۔ امیر خسرو فرماتے ہیں۔ ؎

شہ زن مطرب بنوا گستری

حضرت نظامی گنجوی فرماتے ہیں۔ ؎

بر زخمہ چون سے نوا سازم

کیا اب بھی "ساز دہر سے نوائے حریت" کا لکھنا خلاف محاورہ ہے ؟

کوئل صاحب کی اصلاح واقعی قابل داد ہے۔ گو یہ اصلاح خود اصلاح طلب ہے۔

(۱) پہلے شعر کا مصرعہ اول صاف بے عیب اور چست ہے۔ البتہ ابتدا با ستفہام کی وجہ سے جو بلاغت کے مصرعہ میں پیدا ہو گئی تھی وہ ہاتھ سے جاتی رہی۔ دوسرے مصرعہ میں دل شاد سے مغموم بدل دیا۔ اقبال نے فراموش کی مشق پرستی بیان کی تھی۔ کوئل صاحب اسکی زندہ دلی اور خوش باشی بیان فرماتے ہیں۔

(۲) دوسرے شعر میں مصرعہ ثانی غور طلب ہے۔ سرگران کے متعلق اعتراضات کے سلسلہ میں عرض کر چکا ہوں۔ لفظ داد دو جگہ آیا ہے۔ ایک بالکل فضول اور حشو ہے۔

(۳) تیسرے شعر مصرعہ اول میں "سش" را دونوں میں سے ایک زائد ہے۔ از ہم بالکل پنجرتی کے لئے لایا گیا ہے۔ اگر شیراز کو لفظا استعمال کرنا تھا تو یوں کہنا چاہئے تھا۔

روسس را شیراز جمعیت ملت گسیخت

(۴) چوتھے شعر کے دونوں مصرعے یونان اور چین کے اُنکے اعلان کے بغیر موزوں نہیں ہوتے کیا فارسی ترکیب کی حالت میں یہ جائز ہے ؟

(۵) پانچویں شعر میں دوسرے مصرعہ کو موزوں کرنے کے واسطے بلند کی دال کو مشدد پڑھنا پڑتا ہے۔ حالانکہ دال مشدد نہیں بلکہ ساکن ہے۔

(۶) چھٹے شعر کے پہلے مصرعہ میں دل ہی سے بیدار دل دریا ہونا چاہیئے۔ نارو سے کی آرزو کا بڑا ذریعہ ماہیگیری ہے اور مچھلی دریا سے نکلتی ہے۔

(۷) آٹھواں شعر نظم کے سلسلہ بیان سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ نظم میں تقسیم ازل کا ذکر ہے نہ کہ انقلاب زمانہ کا۔ اور اس شعر میں گردش روزگار کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

آخر میں چند لفظ ان دو لفظوں کی عام روح (اسپرٹ) کے متعلق عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی نظم پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی انفرادی شخصیت وطن کی

اجتماعی شخصیت میں جذب کردی ہے۔ اقبال اسوقت اقبال نہیں بلکہ بدنصیب ہندوستان ہے۔ اسکا دل ہندوستان کا دل ہے۔ اسکی زبان ہندوستان کی زبان ہے۔ اسکا کلام اقبال کے خیالات کی تعبیر نہیں بلکہ ہندوستان کے جذبات کی ترجمانی ہے۔ غرض وہ اسوقت ہندوستان کے دل سے محسوس کررہا ہے۔ اسی کے دماغ سے سوچ رہا ہے اور اسی کی زبان سے بول رہا ہے۔ اسلیئے وہ جانتا ہے کہ اس موقعہ پر وہ واعظ ناصح یا خطیب نہیں بن سکتا وہ شاعر اور صرف شاعر بنا چاہیئے یعنی الفاظ کے آب و رنگ سے وطن کے جذبات کی تصویر کھینچنا چاہیئے۔

تھوڑی دیر کے لیئے چشم ظاہر بین کو بند کیجئے اور ہندوستان کا دل بنکر تخیل کی نظر سے دیکھنا شروع کیجئے۔ عالم اور کاروبار عالم پیش نظر ہے۔ فرانس عیش و طرب کی داد دے رہا ہے انگلستان تجارت و حکومت کا نقارہ بجا رہا ہے۔ اس حالت کو دیکھکے جرمنی کی نگاہ رشک حیران اور دل حوصلہ بے تاب ہو۔ اس کا کوہ استبداد زیر و زبر ہو چکا ہے۔ امریکہ سے انسانیت پرستی اور حریت پروری کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے۔ خیال کا مسافر بحیرہ اٹلانٹک کے دونوں جانب سیر کرکے اپنی طرف لوٹتا ہے۔ ہم یعنی ہندوستان۔ کون ہندوستان؟ جو کبھی روحانیت کا چشمہ فیض تھا! جو کبھی آفتاب علم کا مطلع انوار تھا!! جو کبھی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا!!! جو کبھی عیش و عشرت کا جنت آباد تھا!!! آج اسکی کیا حالت ہے!؟ دل پر ایک چوٹ لگتی ہے۔ حسرت کی آنکھ سے یاس کے اشک خونین ٹپکنا چاہتے ہیں۔ ایک نہایت نازک موقع، ایک علم النفسی نکتہ کمال شاعری کی امتحان گاہ، اقبال معمولی شاعر نہیں ورنہ ایک حسرت آمیز شعر کہکے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا۔ اسکی طبیعت نکتہ رس اور دقیقہ سنج ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایک پس ماندہ قوم کے سامنے حسرت و یاس کی تصویر پیش کرنا اسکو موت کا پیغام دینا ہے۔ اسلئے وہ ایک ایسا مضمون تلاش کرتا ہے جو عبرت انگیزی اور خودداری دونوں کی روح سے معمور ہو۔ اسے معلوم ہے کہ ناامیدی کی حالت میں نفس انسانی تسلی آمیز خیال کے سہارے تشنہ لب ہوتا ہے۔ اسے یہ بھی خبر ہے کہ یورپ و امریکہ اگرچہ مادیات میں اوج ترقی پر پہنچ گئے روحانیات میں انکے بال صفر ہے۔ اسکے مقابلہ میں ہندوستان کو دنیاوی حیثیت

زندہ رہنے والا ہے لیکن روحانیت و مذہب اسکی زندگی کا عنصر غالب ہے۔ ان حالات کو پیش نظر رکھکے وہ ایک ایسا مرقع پیش کرنا چاہتے ہیں جسمیں مغرب کی مادی ترقی اور روحانی تنزل اور ہندوستان کا مادی افلاس اور روحانی دولتمندی پہلو بہ پہلو نظر آئیں۔ وہ یہ خوب جانتا ہے کہ خدا کا نام اسکے ہموطنوں کے لئے کیا کشش رکھتا ہے۔ اسلئے وہ ساز شاعری کے اسی تار کو چھیڑتا ہے اور ایک عبرت و تسلی آمیز نغمہ اس شعر کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہر کسے در خور فطرت از جناب او ببرد
بہر ما چیزے ز بود خویش را با ما سپرد

کرنل صاحب کی نظم پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسکا ناظم قوم کا ایک درد مند و غمخوار ناصح ہے۔ وہ دنیا کی چہل پہل، ہل چل، جد و جہد اور رونق و گرم بازاری اور اسکے مقابلہ میں اپنے عزیز وطن کی بے چینی و بے بسی کو دیکھتا ہے۔ اسکا دل خون ہوتا ہے۔ اور یہ خون دل شعر بنکے ٹپکنے لگتا ہے۔ وہ درد و غم سے بے چین ہے۔ اس بے چینی کے عالم میں اقبال کی سبق آموزی اور خودداری کا سرسشہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ وہ اپنے وطن کی پس ماندگی کا ذمہ دار صورت آرائے ازل کو سمجھتا ہے اور ایک شکوہ سنج لہجہ میں چیخ اٹھتا ہے۔

پیش ہر یک بہرہ از خوان الوانش نہاد
ہند را بہر تماشا چشم در پر آب داد

اصل یہ ہے کہ کرنل صاحب نے اقبال کے نقطۂ خیال کو نظر انداز فرما دیا چونکہ نقطۂ خیال بدل گیا اسلئے اصلاح شدہ نظم میں نہ وہ روح رہی جو اصل نظم میں تھی اور نہ وہ اثر و کیف۔

مآل کار اقبال و بھولا ناتھ کے متعلق یہ چند سرسری اشارات ہیں۔ اقبال کی نظم میں بلاغت کے جو لطیف و نازک نکتے ہیں وہ تفصیل کے طالب ہیں جو اس مختصر مراسلت کے لئے موزوں نہیں۔ اسلئے قلم انداز کرتا ہوں۔

خواجہ عبدالواحد ندوی سابق ایڈیٹر الندوہ

زمانہ مارچ ۱۹۱۶ء

اقبال کے ناقد کرنل بھولا ناتھ کے تعارف میں

ان کی ایک تصویر، اوران پر نگم کا ایک مضمون!
اور 'کیا شکایت کیجئے، فلک کج رفتار کی' کہ:
اگلی بار نگم کو ان کی تعزیت بھی لکھنی پڑی!

(52)

کرنل بھولا ناتھ

کرنل بھولا ناتھ، جن کی تصویر گذشتہ نمبر میں شائع ہو چکی ہے، ہندوستان کے اُن فرزندوں میں ہیں جن کی ذات مادرِ وطن کیلئے ہمیشہ مایۂ ناز رہیگی۔ آپ قوم کے راجپوت ہیں آبا و اجداد کا وطن اصلی ضلع پرتاب گڑھ ہے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں آپکے دادا پنجاب میں آئے اور یہیں سکونت اختیار کر لی آپ ۱۸۶۳ء میں لاہور میں پیدا ہوئے اور لاہور ہی میں تعلیم شروع ہوئی۔ طباعی اور ذہانت کے آثار ابتدا ہی سے نمایاں تھے۔ لیکن طبیعت کا اصلی جوہر اُسوقت کھلا جب آپ نے طبی تعلیم شروع کی ۱۸۸۳ء میں آپ لاہور میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اُسوقت آپکی عمر صرف ۱۷ سال کی تھی۔ کالج میں داخل ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ ایک ہونیوالے ممتاز طبیب کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ۱۸۸۷ء میں آپکی عمر کا بیسواں سال تھا کہ آپ اپنے درجہ کے تمام طلبا سے گوے سبقت لیگئے۔ اور امتحان طبیعات میں درجہ اول حاصل کرنیکے علاوہ وائسرائے ڈفرن (ڈفرن گولڈ میڈل) اور تمغہ جراحی (سرجیکل میڈل) اور دیگر انعامات حاصل کیے۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے بعد آپ ایک متوسط درجہ کے طبیب ہو سکتے تھے۔ لیکن آپکی قابلیت اس سے وسیع تر میدان کی طالب تھی۔ اسلیے ۱۸۸۸ء کے آخر میں طبی تعلیم کی تکمیل کے لیے آپ انگلستان تشریف لیگئے اور وہاں "سینٹ ٹامس ہاسپٹل" میں داخل ہوئے اور تکمیل تعلیم کے بعد آپ ۱۸۹۳ء میں (انڈین میڈیکل سروس) میں داخل ہوئے۔

سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں آپکا قیام سرحد مغربی، پنجاب، بنگال، ممالک متوسط بمبئی، مدراس، برہما، عدن، ایران، اور عراق عرب میں رہا۔ آپ ایران سے رخصت لیکے ولایت تشریف لیگئے تھے کہ جنگ یورپ شروع ہوگئی اور آپ رخصت سے واپس بلائے گئے۔

اسوقت سے آج تک آپ برابر فرائض ملازمت انجام دے رہے ہیں۔ اس اثنا میں آپ تین سال تک عراق عرب میں "نمبر ۱۰ انڈین جنرل اسپٹل" کے افسر اعلیٰ رہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صیغۂ فوج میں ایک ہندوستانی کو اتنی بڑی ذمہ داری دی گئی تھی۔ لیکن ہم اہل ہند کی خوش قسمتی سے آپ نے اس اہم ذمہ داری کو اس خوبی سے ادا کیا کہ حضور وزیر ہند نے اپنی ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء کی تقریر میں آپکی خدمات کا پرزور تعریف الفاظ میں اعتراف کیا اور یہ فرمایا کہ "ہندوستانیوں کو جب ذمہ داری کا کام دیا جاتا ہے تو وہ اُسے کامیابی کے ساتھ انجام دینے کے قابل ثابت ہوتے ہیں" آپکی خدمات کے صلہ میں سرکاری مراسلات میں آپکا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ اور سی۔ آئی۔ ای کا معزز خطاب عطا ہوا۔

آپکے شفاخانہ کا کام جس خوبی اور کفایت شعاری سے ہوتا تھا اُسکی خبریں دفتر جنگ میں پہونچتی رہتی تھیں۔ اسکے مقابلہ میں دوسرے شفاخانوں کی حالت اطمینان بخش نہ تھی۔ آخر یہ طے پایا کہ ایک مجلس تحقیقات خدمت طبی و میڈیکل سروس کمیٹی مقرر کیجائے اور یہ مجلس عراق عرب کے تمام شفاخانوں اور دواخانوں کی تحقیقات کرکے موجودہ حالت اور آئندہ اصلاحات کے متعلق اپنی روداد پیش کرے۔ اس مجلس کے صدر آپ قرار پائے۔ اس مجلس نے سات ماہ تک کام کیا۔ مختلف مقامات پر دورہ کرکے تمام ہندوستانی اور انگریزی شفاخانوں کی تحقیقات کی اور نہایت مناسب و معقول تجاویز پیش کیں۔ جن کے نفاذ سے حُسن انتظام کے علاوہ بلا سبب لغو لاکھوں روپیہ کی بچت ہونے لگی۔

جنوری ۱۹۱۹ء میں آپ بعارضہ نزلہ وبائی (انفلوانیزا) وفات بعد (نمونیا) مبتلا ہوکر ہندوستان تشریف لائے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ آپ ان دونوں امراض سے بہت جلد صحت یاب ہوگئے۔ ہندوستان آئے ہوئے ابھی دو ماہ نہیں گذرے تھے کہ آپ میڈیکل سروس کمیشن کے رکن مقرر ہوئے۔

جسکے فرائض انجام دینے کے بعد اب آپ اسسٹنٹ ڈائرکٹر میڈیکل سروس مقرر کیے گئے ہیں۔ یہ عہدہ بھی ابتک کسی ہندوستانی نہیں ملا تھا۔ تنخواہ اور الاؤنس وغیرہ

کے لحاظ سے یہ منصب انسپکٹر جنرل اسپتالات کے مساوی ہے۔

ایک حاذق طبیب، اور خوش انتظام افسر کے علاوہ آپ بڑے علم دوست، مشہور زبان دان، دربرست انشاء پرداز، اور خوشگو شاعر بھی ہیں۔ طبی مشاغل کے باوجود آپکا عام علمی مطالعہ قابل رشک ہے۔ ایشیا اور یوروپ کی زبانوں میں سے آپ فارسی، عربی، جرمن، فرنچ، اور انگریزی زبانیں جانتے ہیں۔ عام متفرق مضامین کے علاوہ طب جدید (ڈاکٹری) پر آپ کی ایک بیش تصنیف "علم و عمل طب" موجود ہے۔ اس کتاب میں آپ نے جس تحقیق کے ساتھ طب جدید کے دقیق مسائل کو عام فہم سلیس اور دل نشین انداز میں بیان کیا ہے اسکا اندازہ صرف کتاب کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے۔ آپکا دائرۂ معلومات طب جدید تک محدود نہیں بلکہ آپ کی نظر طب قدیم پر بھی ہے۔ ایسا آپنے نہایت بے تعصبی اور نکتہ سنجی کے ساتھ قدیم و جدید طب کا موازنہ بھی کیا ہے۔

فن شاعری کی آپ نے باقاعدہ تحصیل نہیں کی لیکن بایں ہمہ چونکہ آپ طبعزاد شاعر ہیں اس لیے وقتاً فوقتاً دل کے جذبات فارسی اور اردو اشعار کے لباس میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

آپکی شریک زندگی (مسز بھولا ناتھ) بھی آپ کیطرح راجپوت ہیں۔ مسز بھولا ناتھ اپنے جگر گوشوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ۱۹۱۸ء سے لندن میں مقیم ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں ہندوستانی سپاہیوں کے آرام و آسایش کیلیے لندن میں جو انجمن قائم ہوئی تھی آپ اسکی ناظم تھیں۔

آپکے دو صاحبزادے ہیں۔ بڑے اندور کیڈٹ کالج میں فوجی تعلیم پا رہے ہیں اور چھوٹے ابھی انگلستان میں زیر تعلیم ہیں۔ (نومبر ۱۹۱۹ء)

کرنل بھولا ناتھ

کرنل بھولا ناتھ صاحب کی ناگہانی وفات بھی قلب کی حرکت بند ہو جانے سے لاہور میں ہوئی۔ آپ پچھلے سال آل انڈیا میڈیکل کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ اور آپ کی صدارتی تقریر بلوں اور عمدہ آزاد خیالی دونوں لحاظ سے سیاسی طبقوں اور طبی حلقوں میں خاص طور پر پسند کی گئی تھی۔ آپ آنریری میڈیکل سروس کے ممتاز رکن تھے اور اسکی انتہائی منزل تک ترقی کر کے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ نے جنگ کے زمانہ میں عراق و عرب کے محاذ پر غیر معمولی مشکلات کی موجودگی میں قابل قدر بھی خدمات انجام دی تھیں جس کے صلے میں گورنمنٹ ہند نے آپکو سی۔ آئی۔ ای کا معزز خطاب عطا فرمایا تھا۔ آپ ایک صاف گو افسر تھے۔ اور ملازمت کی پابندیوں کے باوجود حق بات اور اصول کے معاملے میں بڑے سے بڑے سرکاری افسروں سے لڑ جاتے تھے۔ ڈیکل سروس میں محض اپنی قابلیت کے زور پر ترقی کرتے ہوئے کرنل ملازمت کے دوران میں آپ کو بعض عہدہ داروں کے تعصبات کا بھی مقابلہ کرنا پڑا تھا مگر آپ نے مقابلہ سے کبھی گریز نہیں کیا۔ اور خوشامد اور تملق سے ہمیشہ دور رہے۔ اپنی خودداری قائم رکھنے کے لئے آپ ہر وقت ایثار کیلئے بھی تیار رہتے تھے۔ اردو فارسی زبان کے بڑے ماہر قدردان تھے۔ یورپ کے علاوہ آپ تمام بلاد اسلامیہ کا مفصل دورہ کر چکے تھے۔ جس سے آپ کو مسلم معاشرت کا خاص تجربہ حاصل تھا۔ مصری، ایرانی اور ترکی لٹریچر سے بھی آپ کو خاصی واقفیت اور انگریزی طریق طلب کے ہر حیثیت سے علاوہ آپ کو یونانی اور آیورویدک طریقوں سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ درحقیقت آپ علم و فن کے بڑے قدردان تھے۔ اور دوا ب کے آپ خاص طور پر دلدادہ تھے اور تصوف و فلسفہ سے آپ کو دلی لگاؤ تھا۔ فرصت کی پرانی جلدوں میں آپ کے کئی بلند پایہ مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ آپ نے کئی چیزیں قابل قدر کتابیں بھی لکھیں جس میں سے علم و عمل خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ فرصت پر آپ کی خاص نظر عنایت تھی۔ کئی سال تک آپ نے اسکی میں کا بیان خرید کر مستحقین میں تقسیم کیں۔ دو ایک موقعوں پر آپ اس سے ناراض بھی ہو گئے۔ لیکن یہ ناراضگی ہمیشہ عارضی ثابت ہوئی اور چند روز بعد آپ کے لطف و کرم کا سلسلہ پھر اسی طرح جاری ہو گیا۔ آپ سچے محب وطن اور آزاد خیال و صاف باطن بزرگ تھے۔ اور علم و ہنر کی قدر دانی اپنا فرض سمجھتے تھے۔

پچھلے سال آپ نے ڈیکل ایسوسی ایشن کے توسیع مقاصد کے فاضل تمام ہندوستان کا دورہ کیا۔ غرض جس کام
لیتے اُسے پوری قوت کے ساتھ انجام دیتے جس تحریک کو شروع کرتے اسکو انتہائی منزل تک پہونچانے کے لئے
مستعد ہو جاتے تھے۔ وطن کی محبت اور اہل قلم کی عزت آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ہر ایک سے
کشادہ دل سے ملتے۔ خانگی زندگی میں بکثرت مشکلات سے سامنا رہا جسکی وجہ سے آپ آخر میں کسی قدر مال گزار
بنے تھے۔ چند ماہ پیشتر آپ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہو گیا تھا جس کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ افسوس
ہے آپ کی خدمات سے بھی ملک محروم ہو گیا۔

کلامِ اقبال-۲

کلامِ اقبال

بختِ مُسلم کی شبِ تار سے ڈرتی ہے سحر
تیرگی مین ہے یہ شب دیدۂ آہو کی طرح
ہے اندھیرے مین فقط مولوی صاحب کی نمود
بنکے شمس العلما چمکے ہین جگنو کی طرح

دیکھئے چلتی ہے مشرق کی تجارت کبتک
شیشۂ دین کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنون نشترِ تعلیمِ جدید
میرا سر جن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

(اقبال)

نادر جنوری ۱۹۱۰ء

ابر

اُٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر سپاہِ آہن کا

نہاں ہوا جو رُخِ مہر زیرِ دامنِ ابر
ہوا نے سرد بھی آئی سوار توسنِ ابر

پیامِ عیش و طرب آسمان سے آیا
ثبوتِ جلتے ہے لاکھوں سے آیا

گرج کا شور نہیں ہے خموش ہے یہ گھٹا
عجیب شے کدۂ بے خروش ہے یہ گھٹا

چمن میں حکمِ نشاطِ مدام لائی ہے
قبائے گل میں گھٹا ٹکنے کو آئی ہے

جو پھول مہر کی گرمی سے سو چلے تھے اُٹھے
زمین کی گود میں چونکے سوئے تھے اُٹھے

نمودِ ابر سے ہشیار ہو گیا سبزہ
ریسی کے ہجر میں گویا اُداس تھا سبزہ

ہوا کی نم سے ہوئی نرم سرو کی ٹہنی
جو آ کے فاختہ بیٹھی تو جھک گئی ٹہنی

ہلا رہی ہے سرِ شاخِ گل کو موج ہوا
بنا ہے باغ میں بلبل کے واسطے جھولا

نشیمنوں سے نکل کر پرند گاتے ہیں
ہوا میں کھیلتے پھرتے ہیں چہچہاتے ہیں

چمن میں سرو برائے نماز اُٹھا ہے
وضو کرانے کو سقائے ابر آیا ہے

اُتر کے آ گئے وادی میں ابر کے ٹکڑے
دیا ہوا سے پریشان ہیں روئی کے گالے

مری نگاہ میں پھرتا ہے اور ہی نقشا
جو دیکھتا ہوں خرامِ سکون نما اُن کا

کھڑے ہیں محفلِ قدرت کو دیکھنے والے
کسان کھیتوں سے اُٹھ اُٹھ کے جھونپڑوں کو چلے

جفاکشی کا خضیر کیسے دن کسانوں کو
یہ سبز کرتے ہیں کہسار کی چٹانوں کو

ہوا کے زور سے ابھرا بڑھا اُڑا بادل
اُٹھی وہ اور گھٹا لو برس پڑا بادل

عجیب خیمہ ہے کہسار کے نالوں کا
یہیں قیام ہو وادی میں پھر تیوالوں کا

رُباعی

واعظ ترے نغمے سے ہوں میں حیران
منطق ہے تری نئی سنا طرزِ بیان

انسان کے واسطے ہے مذہب لیکن
تو کہتا ہے مذہب کے لیے ہے انسان

اقبال

---

[1] ریسی آج دین ایک پہاڑی کا نام ہے ۱۲

زمانہ جون ۱۹۱۱ء

ہمارا تاجدار

ہمارے اوجِ سعادت ہوا آشکار اپنا
کہ تاجپوش ہوا آج تاجدار اپنا
اُسی کے دم سے ہے عزّت ہماری قومِ یمن
اُسی کے نام سے قائم ہے اعتبار اپنا
اسی سے عہدِ وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کے خاکِ قدم پر ہے دل نثار اپنا

محمد اقبال لاہور

زمانہ دسمبر ۱۹۱۱ء

کشکول[1]

ایک آرزو

از ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ڈی

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن میں جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں اور دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوں جس پر تقدیر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں گا
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شور شوں میں باجا سا بج رہا ہو

گیتوں کا ہو نظارہ میری کتاب خانی
وہ نغمہ معرفت کا جو گل کھلا ہوا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہان نما ہو

ہو لالہ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرما کے جس سے جلوت خلوت میں مہ ادا ہو

مانوس اسقدر ہو صورت سے میرے بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صاف آئینہ سے دونوں جانب بنا ہوا ہو
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بنکر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کے سویا ہوا ہو سبزہ
پڑ پڑ کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہدی فضائے سورج جب شام کی دلہن ہو
سرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

یوں وادیوں میں غیرے آکر شفق کی سرخی
جیسے کسی گلی میں کوئی شکستہ پا ہو

پچھم کو جا رہا ہو یوں اس ادا سے سورج
جیسے کوئی کسی کے دامن کو کھینچتا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
امید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسمان پر ہر سو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی موذن
میں اسکا ہم نوا ہوں وہ میری ہم نوا ہو

---

[1] یہ نظم عنوان سے ہمارے شاعر مشرق کی مدت سے منتظر تھی اردو کے ادب نواز کلام پیش کرتے رہیں گے۔

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احسان
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

ظلمت جھلک رہی ہو اسطرح چاندنی میں
جوں آنکھ میں سحر کی سرمہ لگا ہوا ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

دل کھولکر بہاؤں اپنے وطن پہ آنسو
سرسبز جس کے غم سے بوٹا امید کا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے
بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال اکبر کے رنگ میں

مشرق میں اصول دین جیسا سنتے ہیں
مغرب میں مگر مشین بنجاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے سپنے
واں ایک کے تین تین بنجاتے ہیں

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشنی مغربی ہے مد نظر
وضع مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے اُنسے بدظن ہوگئے
وعظ میں فرمادیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس لیے جب مرد ہی زن ہوگئے

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مرد ہوشمند
غیرت نہ تجھ میں ہوگی نہ زن اُٹھ جائے گی
آتا ہے اب وہ دور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لیے ووٹ چاہیے گی

ہر ملک میں عہدے تقسیم ہوں برابر
ہوتی نہیں ہے ہمکو جنگ جدل سے سیری

غضب پولس میں جب حد ہو گئی ہے قائم
ہندو دین پیدا منصر مسلم دین آزری

تعلیم مغربی ہے بہت جرأت آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں ہاؤ ٹینگ
سیکھے ہیں ہند میں جو خریدار ہی فقط
آقا بھی سیکھے آتے ہیں اپنے وطن سے ہینگ
میاں حال لوٹ کی تو چاہتا ہوں میں
ان کا یہ حکم دیکھ مرے قرش پر نہ تنگ
سکتے لگے آونٹ ہے بھدا سا جانور
اچھی ہے گاسنا رکھتی ہے کیا لمبی لمبی ٹانگ

کبھی اچھی نقیب انجمن نے
وہ سمجھے گا اسے جو کار دان ہے
خدا واحد ہے وہ ناظم ہیں اپنے
وہ کل میں ہمارا آشیان ہے

جناب شیخ کو پلوا دو خاص فنڈ ان کی
عجیب نسخہ ہے یہ خود فراموشی کے لیے
ہوا میں جیتے سے بیزار جب تو فرمایا
کہاں سے لاؤ گے بندوق خود کشی کے لیے

تہذیب کے مریض کو گوبی سے فائدہ
وقت مرض کے وہ بیٹھے پل پیش کیجئے
تھے وہ بھی کہ خدمت استاد سے کھوئے
دل چاہتا تھا یہ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا بھی اور سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

انتہا بھی اسکی ہے آخر تزیدیں کب تلک
چھڑیاں رومال عطر سیر میں یا پان ہے
اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے منسال کابل سے کفن جاپان سے

ہم مغرب کے مسکینوں کا اول خزینہ جیا آکسا ہے
وان کلٹر سب بلوری ہیں یان ایک پرانی شکا ہے
اس دور میں سب تجاہیں ہیں یان باقی رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور کچا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ تو بدھو بنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گر ہوں سے کتنی بلندی سے ان کو تو کود کے پکا ہے
یا ہم پیار کے چلتے تھے دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے یا قرآنی یا جھگڑا ہے

زاہد حسین مشتاق

کشکول

غیرت تیموری

غلام قادر روہیلے نے یادگار سلطنت تیموریہ مغلیہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکلوا دی تھیں جسکی تفصیل تاریخوں میں مذکور ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے اس واقعہ کو یوں نظم کیا ہے:

روہیلا کس قدر ظالم جفا جو کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوک خنجر سے

دیا اہل حرم کو رقص کا فرمان سنگر نے
یہ انداز ستم کچھ کم نہ تھا آثار محشر سے

بھلا تعمیل اس فرمان غیرت کش کی ممکن تھی
شہنشاہی حرم کی نازنینان سمن بر سے

بنایا آہ سامان طرب بے درد نے ان کو
نہاں تھا حسن جنکا چشم مہر و ماہ و اختر سے

دل نازک لرزتے تھے قدم مجبور جنبش تھے
رواں دریائے خوں شہزادیوں کے دیدۂ تر سے

یہ تھی کچھ دیر تک محو نظر آنکھیں رہیں اسکی
کیا گھبرا کے پھر آزاد سر کو بار مغفر سے

گرے پھر وہ تیغ جاں ستان آتش فشاں کھلی
سبق آموز تابانی ہوا انجم جس کے جوہر سے

رکھا خنجر کو آگے اور پھر کچھ سوچ کر لیٹا
تقاضا کر رہی تھی نیند گویا چشم اختر سے

بجھائے خواب کے پانی نے انگارے اسکی آنکھوں سے
مگر شرما گئی ظالم کی درد انگیز منظر سے

پھر اٹھا اور تیموری حرم سے یوں لگا کہنے
شکایت چاہئے کیوں کر نہ کچھ اپنے مقدر سے

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی تکلف تھا
کہ غفلت دور ہو نام صفت آرایان لشکر سے

مرا مقصد یہ تھا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جسکا گئی تیمور کے گھر سے

کلام اقبال

(ایک ویدانتی کا ترجمہ)

خویشوں سے ہوا ذلیل نہ غیروں سے خطرہ ہو
احباب سے کھٹکا ہو نہ اعدا سے حذر ہو

روشن میرے سینے میں محبت کا شرر ہو
دل خوف سے آزاد ہو بے باک نظر ہو

پہلو میں میرے دل ہو سو آشام محبت
ہر شے ہو میرے واسطے پیغام محبت

اقبال

زمانہ اپریل ۱۹۱۵ء

نوا سنج ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی

از ترجمان حقیقت ڈاکٹر محمد اقبال صاحب

محل ایسا کہاں تعمیر عرفی کے تخیل نے
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
فصد قاصد حیرت خانۂ سینا و فارابی
میسر جس سے آنکھوں کو ہو اشک خانہ تابی

سرے دل نے یہ اکدن آسمی ترت سے شکایت کی
تغیر آگیا ایسا مزاج اہل عالم میں
کہ رخصت ہو گئی دنیا سے کیفیت وہ سیمابی
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بیخوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پہ ستوں پر سحر کی آسمان تابی

صدا ترت سے آئی شکوۂ اہل جہاں کم کن
نوا سنج ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی"
ھدی سا تیز تر پیخواں جو محمل ہے گراں جنبی

(البلاغ)

اقبال

البلاغ ہے: اپریل ۱۹۳۶ء

چھوڑ دے

(ڈاکٹر اقبال)

مجنوں نے شہر چھوڑا تو صحرا بھی چھوڑ دے
نظارے کی ہوس ہو تو لیلیٰ بھی چھوڑ دے

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

بیٹھا ہے جو مسندِ پہ اپنے خدا کا نور دل دیکھ
یہ انتظار صوفی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اللہ غافل تیری زباں پر ہے حرفِ غیر
بیگانہ شے پہ نازشِ بے جا بھی چھوڑ دے

لطفِ کلام کیا جو نہ ہو دل میں زخمِ عشق
بسمل نہیں ہے تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

شبنم کی طرح پھولوں پہ رو اور چمن سے چل
اس باغ میں قیام کا سودا بھی چھوڑ دے

ہے عاشقی میں رسمِ الگ سب سے بیٹھنا
بت خانہ بھی حرم بھی کلیسا بھی چھوڑ دے

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بیٹھا وہ کیا جو ہو نفسِ غیر پہ مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

شوخی سی ہے سوال مکرر میں اے کلیم
شرطِ رضا یہ ہے کہ تقاضا بھی چھوڑ دے

آتی ہے تجھ سے عشق کی دل میں نمود کے
ایسی اچھل کہ نشۂ دنیا بھی چھوڑ دے

واعظ ثبوت لائے ہیں مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

اپریل ۱۹۱۶ء

جنگ اور اہل ہند

(نظم ہذا حسب ارشاد حضور لفٹنٹ گورنر پنجاب بابت جنگی کانفرنس میں پڑھی گئی تھی)

اے تاجدار خطۂ جنت نشان ہند — روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
حکم ترے قلم سے نظام جہان ہند — تیغ نگہ نگاہ تری پاسبان ہند
ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اس وفا کی نذر محقر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقاد شر ہے — ہر روز جنگ تو زہ جگر سوز سینہ ہے
رایت تری سپہ کے سر زیر ظفر — آزادہ پرکشادہ پری زادہ نیم پر
سطوت سے تیری پختہ جہان کا نظام ہے
ترے کا آفتاب سے دنیا مقام ہے

آزادی زبان و قلم سب اگر بیان — سامان صلح و دیر و حرم ہے اگر بیان
تہذیب کاروبار الم ہے اگر بیان — خنجر تیز تاب و تیغ میں دم ہے اگر بیان
جو کچھ بھی ہے علائے شہ محترم سے ہے
آبادی دیار ترے دم قدم سے ہے

وقت آگیا اگر گرم ہو میدان کارزار — پنجاب ہے مخاطب پیغام شہریار
اہل وفا کے جوہر پنہاں ہوں آشکار — محو ہو سیاہ سے پہنائے روزگار
تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہان میں سطوت شاہی کا زور ہو

دیکھے ہیں میں نے سیکڑوں ہنگامہ خیز — صدیوں رہا ہوں میں اسی دنیا کا لغو
طفل صغیر بھی مرے جنگاہ میں ہیں رو — ہوتے ہیں ان کے سامنے شیر نر کے رنگ زرد

میں نہ کہتا ہوں وفا کا محبت ہے پہلی مرا
اس نمونہ پر ہے شاہد عادل مل مرا

ہندوستان کی تیغ ہے فتاح ہشتاب — خونخوار لالہ بار، جگر دار، برق تاب
بیباک، تابناک، گہر پاک، بے حجاب — دلبند، ارجمند، سحر خند، سیم ناب

یہ تیغ دلنواز اگر بے نیام ہو
دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو

اہل وفا کا کام ہے دنیا میں سوز و ساز — بے نور ہے وہ شمع جو ہوتی نہیں گداز
پردے میں موت کے ہے نہاں زندگی کا راز — سرمایہ حقیقت کبریٰ ہے یہ مجاز

سمجھو تو موت ایک مقام حیات ہے
قوموں کے واسطے یہ پیام حیات ہے

اخلاص بے غرض ہو صداقت بھی بے غرض — خدمت بھی بے غرض ہو اطاعت بھی بے غرض
عہد وفا و عہد محبت بھی بے غرض — تخت شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض

لیکن خیال فطرت انسان ضرور ہے
ہندوستان پہ لطف نمایاں ضرور ہے

جبتک چمن کی جلوہ گل پر اساس ہے — جبتک فروغ لالہ احمر لباس ہے
جبتک نسیم صبح عنادل کو راس ہے — جبتک کلی کو قطرۂ شبنم کی پاس ہے

قائم رہے حکومت آئین اسی طرح
ڈرتا رہے چکور سے شاہین اسی طرح

اقبال

زاد مئی ۱۹۱۸ء

پیغامِ اقبال

ہمنشیں افسانۂ بیدار ہے جمہورِ چیز
نقشۂ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دور بیٹھے جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

۱۹۳۱ء

تنہائی

از ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بے تابے — ہمیشہ در طلبِ ہستی چہ شغلے داری؟
ہزار گونہ گوئے لا است در گریبانت — درونِ سینۂ چو من گوہرے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رسید و ہیچ نہ گفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم "این چہ بی دردی است" — رسد بہ گوشِ تو آہ و فغانِ غمزدہ؟
اگر بہ سنگ تو لعلے ز قطرۂ خون است — یکے در آ بہ سخن با من ستم زدہ
بجوہ خزید و نفس در کشید و ہیچ نہ گفت

رہ در از بریدم ز ماہ پرسیدم — "سفر نصیب! نصیبِ تو منزلے است کہ نیست"
چہ ان زیر تو سیلے تو من ز اشکے — فروغِ داغِ تو از جلوۂ دل است کہ نیست
سوئے ستارہ ز تلبانہ دید و ہیچ نہ گفت

شدم بہ حضرتِ یزدان گزشتم از مہ و مہر — کہ در جہانِ تو یک ذرۂ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و دشت خاکِ من ہمہ دل — چمن خموش است اے دردِ تو ایم کہ نیست
نبشتے بہ لب آورد و ہیچ نہ گفت

(اردو) اقبال

اکتوبر ۱۹۲۴ء

تنہائی

از ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال بیرسٹر ایٹ لا

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا — انجم نہیں تیرے ہمنشیں کیا
یہ وسعتِ آسمان خاموش — خوابیدہ زمین جہان خاموش
یہ باد یہ دشت و در یہ کہسار — فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوشرنگ پیارے پیارے — یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل
قدرت تری ہم نفس ہے اے دل

زمانہ دسمبر ۱۹۲۴ء

رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

لکھا ہے ایک مغربی حق شناس نے — اہل قلم میں جسکا بہت احترام تھا
جولانگاہ سکندر رومی تھا ایشیا — گردوں سے بھی بلند تر اسکا مقام تھا
تاریخ کہہ رہی ہے کہ رومی کے سامنے — دعویٰ کیا جو پورس و دارا نے خام تھا
دُنیا کے اُس شہنشہ انجم سپاہ کو — حیرت سے دیکھتا فلک نیل فام تھا
آج ایشیا میں اُسکو کوئی جانتا نہیں
تاریخ دان بھی اُسے پہچانتا نہیں

لیکن بلال وہ حبشی زادۂ حقیر — فطرت تھی جسکی نور نبوت سے مستنیر
جس کا امین اول سے ہوا سینۂ بلال — محکوم اُس صدا کے ہیں خاقان و وزیر
ہوتا ہے جس سے اسود و احمر میں اختلاط — کرتی ہے جو غریب کو ہم پہلو سے امیر
ہے تازہ آجتک وہ نوائے جگر گداز — صدیوں سے سُن رہا ہے جسے گوش چرخ پیر
اقبال کس کے عشق کا یہ فیض عام ہے
رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

بے سلطنت قوم یا جسم بے روح

ہے قوم جسم سلطنت اُس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

سعی شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر
تا تم سمجھ قوم میں خود انتعاش ہے

البتہ زندگانیِ شخصی کا ہے وجود
قانون میں ہر اک کے لئے زندہ باش ہے

پیمانہ ساختہ شاہِ وقت پر
محدود طالبیں کی فکرِ معاش ہے

بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اسکی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملینگے تو کچھ ہونگے جزو غیر
یہ مسئلہ سمجھ ہے گو دل خراش ہے

اپنی یہ احتیاط کہ جو سب پر اکتفا
اُس پر بھی یہ عتاب کہ تو بدمعاش ہے

(ماخوذ)

اقبال

اقبال کے ابتدائی عہد کی ایک نثری تحریر

سودیشی تحریک

سودیشی تحریک

۱۹۰۶ء میں مدیرِ ''زمانہ'' نے ممتاز مسلمان اصحاب فکر ونظر کے نام ایک سوالنامہ جاری کیا جس میں انہیں اس تحریک کے متعلق اظہار رائے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے جواب میں مارچ، اپریل میں حالی، شبلی، ذکاءاللہ اور خواجہ غلام الثقلین اور مئی میں عبدالقادر بی.اے. (جو بعد میں سر عبدالقادر ہوئے) کے لندن اور پروفیسر شیخ محمد **اقبال** ایم.اے. کے، کیمبرج سے بھیجے ہوئے خطوط ''سودیشی تحریک اور رہبران اسلام'' کے زیر عنوان شائع ہوئے۔ اقبال کا خط، جس کی نقل ذیل میں پیش کی جاتی ہے، ان کے سیاسی شعور اور حالات حاضرہ پر حکیمانہ نظر کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے ایک ماہر معاشیات ہی کی حیثیت سے کہا ہے کیوں کہ وہ اس علم کے معلم بھی رہ چکے تھے اور اس میں صاحب تصنیف بھی تھے۔ انہوں نے اہل وطن کو یہ مشورہ دیا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر بدیسی کپڑوں کو آگ لگانا اور بغیر وسائل پیدا کئے بائیکاٹ کرنا معاشی خودکشی کے مترادف ہے۔ مگر حبِ وطن اور بدیشی تحریک کو موزوں ومناسب حدود میں رکھنے سے اتفاق کیا۔ بہرکیف اقبال کا یہ خط ہمارے سامنے بہت سے اہم نکات پیش کرتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(۱) سودیشی تحریک ہندستان کے لئے کیا ہر ملک کے لئے جس کے اقتصادی اور سیاسی حالات ہندستان کی طرح ہوں مفید ہیں۔ کوئی ملک اپنے سیاسی حقوق کو حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ پہلے اس کے اقتصادی حالات درست نہ ہوجائیں۔ ہمارے اہل الرائے ''سیاسی آزادی سیاسی آزادی'' پکار رہے ہیں مگر کوئی شخص اس باریک اصول کی طرف توجہ نہیں کرتا کہ سیاسی آزادی کے شرائط میں سب سے بڑی شرط کسی ملک کا اقتصادی دوڑ میں سبقت لے جانا ہے، جہاں تک اس کا جغرافی مقام اور دیگر قدرتی اسباب اس کے ممد ہوں۔ سیاسی آزادی کوئی معمولی چیز نہیں کہ بغیر دام دیئے مل جائے۔ انگلستان کی سرزمین کے ہر ذرے میں ان لوگوں کا خون چمکتا ہوا نظر آتا ہے جنہوں نے سیاسی حقوق کی خاطر اپنی جانیں قربان کیں۔ باغیوں کی طرح نہیں بلکہ ان لوگوں کی طرح جن کے دلوں میں اپنے وطن کے قانون اور اس کے رسوم کی عزت ہوتی ہے اور جو اپنے گراں قدر خون کے قطرے قانون کی تائید میں بہاتی ہیں، نہ اس کی تردید اور مخالف میں۔ میرا تو یہ مذہب ہے کہ جو قوم خود آزادی کی دلدادہ ہو وہ اوروں کی آزادی کو رشک

کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتی اور انگریزوں کی معاشرت دیکھ کر بھی میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، ہاں ہم لوگوں میں اس کی قابلیت ہونا ضروری ہے اور اس قابلیت کے پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب، جیسا کہ میں نے اوپر اشارہ دکیا ہے، اقتصادی قوانین کو ایک مرکز پر جمع کرنا ہے، جس کی طرف خوش قسمتی سے اب اہل وطن کو توجہ ہوئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ بے وجہ جوش ہماری آرزو کو تاریک کر دیتا ہے اور ہم اس جوش میں ایسی طفلانہ حرکات کر دیتے ہیں جن کا مفید اثر کچھ نہیں ہوتا۔ اور جن کا نقصان دیرپا ہوتا ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی عقل کی بات ہے کہ امریکہ اور جرمن کی چیزیں خریدو مگر انگلستان کی چیزوں کو ہندستان کے بازار سے خارج کر دو۔ مجھ کو تو اس کا اقتصادی فائدہ کچھ نظر نہیں آتا۔ بلکہ انسانی فطرت کے محرکات پر غور کرو تو اس میں سراسر نقصان ہے۔ اس طریقِ عمل سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے ہم کو سخت نفرت ہے، نہ یہ کہ ہم کو ہندستان سے محبت ہے۔ اپنے وطن کی محبت کسی غیر ملک کے مستلزم نہیں ہے۔ علاوہ اس کے اقتصادی لحاظ سے اس میں کچھ فائدہ نہیں ہے۔ مغربی خیالات اور تعلیم کی اشاعت سے اب ہماری ضرورت کا احاطہ وسیع ہو گیا ہے، اور پھر اسی میں بعض اس قسم کی ہیں کہ سردست ہمارا اپنا ملک ان کو پورا نہیں کر سکتا۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ اس طفلانہ فعل سے سوائے اس کے حکام کو خواہ مخواہ بدظن کیا جائے اور کیا فائدہ ہے۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے ہزاروں چیزیں ایسی ہیں کہ ہمارا ملک بعض حوالی خصوصیت اور دیگر قدرتی اسباب کے عمل کی وجہ سے ان کو ارزاں نرخ پر تیار نہیں کر سکتا۔ اس بات کی کوشش کرنا کہ ہماری ساری ضرورتیں اپنی خصوصیات سے پوری ہو جایا کریں۔ سراسر جنون ہے۔ واقعات کے لحاظ سے دیکھو تو یہ بات کسی ملک کو نہ اب نصیب ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اور اگر یہ بات ممکن بھی ہو جائے تو اس میں میرے خیال میں بجائے فائدے کے نقصان ہے جس کی مفصل تشریح اس مقام پر نہیں ہو سکتی۔

سودیشی تحریک کو عملی صورت دینے کے لئے میری رائے میں ان باتوں کا لحاظ ضروری

ہے:

(الف) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو اس وقت ملک میں تیار ہو رہی ہیں اور ان کمیت اور کیفیت کیا ہے۔

(ب) وہ کون سی مصنوعات ہیں جو پہلے تیار ہوئی تھیں اور اب نہیں ہوتیں۔

(ج) وہ کون سی مصنوعات ہیں جن کو ہم خصوصیت سے عمدہ اور ارزاں تیار کر سکتے ہیں۔

(د) ملک کے صوبوں یا دیگر قدرتی حصص کے لحاظ سے وہ کون کون سے مقام ہیں جو بعض اسباب کی وجہ سے خاص خاص مصنوعات کے لئے موزوں ہیں۔

(ھ) تخمیناً کس قدر سرمایہ زیورات وغیرہ کی صورت میں معطل پڑا ہے اور اس کو استعمال میں لانے کے لئے کی غرض سے کیا وسائل اختیار کیے جائیں۔

ان تمام امور کا لحاظ رکھ کر عملی کام شروع کرنا چاہیے۔ ضرور ہے کہ ابتدا میں ناکامی کا سامنا بھی ہو۔ مگر کوئی بڑا کام سوائے قربانی کے نہیں ہوا۔ کسی ملک کے اقتصادی حالات کا درست ہونا تھوڑے عرصے کا کام نہیں ہے۔ اس میں صدیوں کی ضرورت ہے۔ ہم نقصان اٹھائیں گے تو ہماری آئندہ نسلیں فائدہ اٹھائیں گی۔ علاوہ اس کے مشترک سرمائے کی جماعتیں نہایت مفید ثابت ہوں گی، خصوصاً ہمارے ملک میں جہاں کے لوگ کم سرمایہ رکھتے ہیں، سرمائے کے بہترین نتائج اس وقت پیدا ہوے ہیں۔ جب اس کی مقدار بڑی ہو۔ مگر عملی لحاظ سے کامیاب ہونے کے لئے سب سے بڑی ضرورت اصلاح اخلاق کی ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سکھاؤ، ان کے اسرافی عادات پر نکتہ چینی کرو۔ اور ان کے دل پر یہ امر نقش کرو کہ انسان کی زندگی کا مقصد خودغرضی کے پردے میں بنی نوع انسان کی بہتری کی جستجو ہے۔

افسوس ہے کہ میں جیسا چاہتا تھا ویسا جواب نہیں لکھ سکا۔ کچھ اس خیال سے کہ زیادہ

تعویق مناسب نہ ہوگی۔

(۲) سیاسی حقوق کے حصول کی دوسری بڑی شرط کسی ملک کے افراد کے اغراض کا متحد ہونا، اگر اتحاد اغراض نہ ہوگا تو قومیت پیدا نہ ہوگی، اور اگر افراد قومیت کے شیرازے سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ نہ ہوں گے تو نظام قدرت کے قوانین ان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غل کی طرح مٹا دیں گے۔ قدرت کسی خاص فرد یا مجموعۂ افراد کی پروانہیں کرتی۔

مگر رونا تو اسی کا ہے کہ لوگ اتفاق اتفاق پکارتے ہیں اور عملی زندگی اس قسم کی اختیار نہیں کرتے جس سے ان کے اندرونی رجحانات کا اظہار ہو۔ ہم کو قال کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا کے واسطے حال پیدا کرنے کی کوشش ب دنیا میں صلح کرانے کے لئے آیا ہے نہ کہ جنگ۔

میری رائے میں اس تحریک کی کامیابی سے مسلمانوں کو ہر طرح فائدہ ہے۔ ایک صاحب نے کسی اخبار میں یہ خط چھپوایا تھا کہ مسلمانوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے کیوں عام طور سے مسلمان زراعت پیشہ ہیں۔ ان کا یہ ارشاد شاید پنجاب کی صورت میں صحیح ہو۔ تاہم یہ کہنا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ مسلمان زراعت پیشہ ہیں، اس امر کی دلیل نہیں ہوسکتا کہ سودیشی تحریک کی کامیابی سے کچھ فائدہ نہیں ہے، اگر مصنوعات سستی ہوں (جو بالآخر اس تحریک کی کامیابی کا نتیجہ ہوگا) تو خریدنے والوں کو بھی فائدہ ہے اور بیچنے والوں کو بھی۔ مسلمان خواہ بیچنے والے ہوں خواہ خریدنے والے، ہر طرح فائدے میں ہیں، ہاں اگر بیچنے والے ہیں تو ان کو فائدہ ہے، اور یہ کون کہتا ہے کہ وہ بایع نہ بنیں۔

(۳) اگر صبر و استقلال سے کام کیا گیا تو اس تحریک میں ضرور کامیابی ہوگی۔ دور اندیشی تمام کامیابی کا راز ہے۔ ایک حد تک تو اس تحریک کے مطابق ملک میں عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اس عمل کی توسیع کی ضرورت ہے جو اس صورت میں ممکن ہے کہ عمدہ اور ارزاں مصنوعات پیدا کر کے گراں اور ظاہری نمائش والی چیزوں کو ملک سے نکالو۔ مقدس عہد لینا کہ ہم خارجی

ممالک کے مصنوعات کا استعمال نہ کریں گے۔اور جوش میں آخر انگریزی کپڑے کے کوٹ آگ میں پھینک دینا ایک طفلانہ فعل ہے۔ جو اقتصادی لحاظ سے غیر مفید اور سیاسی لحاظ سے مضر ہے۔ اگر اس تحریک سے ہندو اور مسلمانوں میں اتحاد اغراض پیدا ہو جائے اور رفتہ رفتہ قوی ہوتا جائے تو سبحان اللہ اور کیا چاہیے۔ ہندستان کے سوئے ہوئے نصیب بیدار ہوں اور میرے دیرینہ وطن کا نام علی قلم سے فرق اقوام میں لکھا جائے۔

والسلام

محمد اقبال (۱۹۰۶ء)

☆☆☆

بیان ملکیت سہ ماہی خدابخش لائبریری جرنل

مطابق فارم نمبر ا، قاعدہ نمبر ۳

ا۔ جرنل کا ٹائٹل	:	خدابخش لائبریری جرنل
۲۔ وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محمد جاوید اشرف
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۵۔ ایڈیٹر کا نام	:	ڈاکٹر شائستہ بیدار
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۶۔ ملکیت	:	خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

میں محمد جاوید اشرف اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محمد جاوید اشرف

سرسید کا 'اخبار سین ٹیفک سوسئٹی، علی گڈھ'

"THE ALIGARH INSTITUTE GAZETTE"

(۱) ابتدائی مجلدات کا قدیم ترین مطالعہ (نوائے ادب ۱۹۶۱)

اور

(۲) گزٹ کا جدید ترین مطالعہ (ڈاکٹر طاہر مسعود، ۲۰۰۲)

(ش)

فہرست

اخبار کے پہلے شمارے کے پہلے صفحے کا عکس، ۱۴۶

پیش گفتار، ۱۴۷

سرسید کے 'اخبار سین ٹیفک سوسئٹی علی گڈھ' کا **قدیم ترین** مطالعہ: ۱۸۶۶ء-۱۸۶۹ء ۱۵۶

سرسید کا 'اخبار سین ٹیفک سوسئٹی علی گڈھ' کا **قدیم ترین** مطالعہ : ۱۸۷۳ء ۱۶۹

پس گفتار ۱۸۰

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا **جدید ترین** بھرپور مطالعہ ۱۸۲-۲۰۰

THE ALIGURH INSTITUTE GAZETTE

اخبار
سئین ٹیفک سوسئٹی علیگڈھ

LIBERTY OF THE PRESS IS A PROMINENT DUTY OF THE GOVT. AND A NATURAL RIGHT OF THE SUBJECTS.

NOTICE

اطلاع

سرسید کے گزٹ کا پہلے شمارے کے پہلے صفحہ کا عکس

۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء

(۳)

پیش گفتار

وہ جو امیر المومنین کا فرمودہ ہے کہ: **یہ دیکھو کہ کیا کہا ہے، یہ نہ دیکھو کس نے کہا ہے**، تو اصل غرض متن سے ہے جو کام کا ہے؛ اور غیر معمولی کام کا اس لئے ہے کہ سید کے گزٹ پر پہلا تفصیلی مطالعہ ہے، اور وہ بھی قریباً ساٹھ سال پہلے کا، اس وقت کا جب لوگوں کے پاس وقت وافر تھا، مطالعہ کا شوق تھا، اور یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو نورٌ علیٰ نور! نتیجہ میں = قیمتی دستاویز، سید کے گزٹ کا ایسا تجزیاتی مطالعہ۔ جس سے ان کی فکر کے متعدد گوشے روشن تر ہو کے سامنے آسکیں گے۔

●

جی چاہتا تھا کہ ہمارا عنوان اکبر الہ آبادی کے مشہور شعر کے مصرعہ اول کے نیمۂ اولیٰ سے مستفاد ہووے، البتہ ہم اسے عنوان بناتے تو ''سید اٹھے **جو**'' کو ''سید اٹھے **تھے**'' کر دیتے: ''سید اٹھے تھے گزٹ لے کے''۔ مگر بالآخر طے یہ پایا کہ شاعری بھنگارنے کے بجائے راست عنوان بہتر ہوگا کہ فوراً سمجھ میں آجائے کہ ملاحظہ میں آنے والی تحریروں کی نوعیت کیا ہے؛ اور اس لئے عنوان کا نام سیدھا سادہ ہی رکھ دیا گیا؛ جس میں بتا دیا جائے کہ یہ آزادی کے بعد سید کے گزٹ پر قدیم ترین مطالعہ کی پیشکش ہے۔ اور۔ **دوسرے نمبر پر** : سید کے گزٹ کا جدید ترین مطالعہ۔

●

قریب ساٹھ سال ہونے کو آئے، نوائے ادب (ممبئی) کے ۱۹۶۱ء کے چند شماروں میں سر سید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی بھولی بسری یاد کو تازہ کیا گیا، اور گزٹ کے اولیں چند مجلدات کے مطالعہ کے نتائج مندرج کیے گئے، تو سر سید اور علی گڑھ تحریک کے وابستگان کو اچھا لگا کہ آزادی کے بارہ پندرہ برس کے اندر علی گڑھ تحریک کے اہم ترین آرگن کو ادبی دنیا میں تفصیل سے متعارف کرا دیا گیا۔

مگر پھر وہ سب کچھ پچھلے پچاس ساٹھ برس میں نذرِ طاق نسیاں ہوتا گیا۔ سید کا دوصدی جشن منایا جانے لگا تو اس کی یاد بھی آئی۔ گزٹ کے اولیں تفصیلی جائزہ کی بازیافت ہوئی تو خیال آیا کہ اس کی از سرِ نو پیشکش، اس وقت جب ہم سید کا دوصدی جشن منا رہے ہیں، تو نوائے ادب کی شکر گزاری

کے ساتھ یہ علی گڑھ وابستگان کے لئے خوشی کا باعث ہوگی۔

اور دوہری خوشی اس سے ہوگی کہ ایک تازہ ترین مطالعہ بھی ہمیں مل گیا، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

●

سید کا گزٹ برصغیر میں اخبار نویسی کا پہلا سنگ میل ہے۔ یہ انگریزی اردو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا، ایک کالم میں انگریزی چلتی، ایک میں اردو۔ ہندستان میں سنہ ستاون کے بعد ایک قوم حاکم تھی دوسری محکوم؛ دونوں کے درمیان رابطہ قائم کرنا ضروری تھا۔ انگریزوں کے لئے انگریزی میں نیوز اور ویوز (News & Views) پہنچانا ضرور تھے، بلکہ زیادہ ضروری تو ویوز ہی کہہ لیجیے؛ اور اردو والوں تک نئے حالات کے تحت ویوز بھی اور نیوز بھی؛ اور وہ بھی ٹائپ میں جب ہر طرف لیتھو کی طباعت کا دور دورہ تھا۔

●

سید کے گزٹ کا یہ پہلا وقیع مطالعہ ہے : چار اولیں برسوں کے گزٹ کے مطالعہ کے نتائج ہیں (۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۹ء)۔ اور اس کے ساتھ پانچواں، چار سال بعد کا، ۱۸۷۳ء کا گزٹ بھی شاملِ مطالعہ ہے۔ (**البتہ کئی جگہ** محسوس ہوا کہ صرف عنوان یا صرف چند سطری خلاصہ نہ ہوتا، تفصیل کچھ زیادہ ہوتی تو اچھا ہوتا)۔

●

یہ قدیم ترین مطالعہ پہلی بار سامنے آیا تو : آزاد ہندستان میں سید کی قدر و قیمت کا زیادہ بہتر اندازہ ہونے لگا تھا، جس کی وجوہات بھی تھیں! ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ آزادوں کو اپنی خودی کی پہچان ہونے لگی تھی۔ دوسری وجہ آزاد علی گڑھ کے پہلے سردار، سید کے پہلے ممتاز معنوی فرزند! ذاکر صاحب نے آزاد ہندستان کی پہلی نسل کو جتایا کہ سید اس نسل کے لیے کس درجہ کے عظیم بن کر ابھر رہے تھے۔ پھر مزید جتانے والے رشید صاحب تو علی گڑھ ہی میں موجود تھے، لیکن سید کو آزاد **ہندستان کا شہری** بنانے میں اب جو خصوصی رول رہا وہ سرور صاحب کا تھا، خاص طور سے ان کی وہ تحریریں جب نقادی چھوڑ چھاڑ کے انھوں نے فکری گرہیں سلجھانا شروع کر دی تھیں۔ ذاکر صاحب کے اس **ہندستانی** مرید خاص نے جب وہ ''ہندستان کدھر'' لکھ رہے تھے، تو اسی کے آس پاس علی گڑھ کا ایک اور دیوانہ تیار کر دیا تھا: رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرور کا آمیزہ! جنھوں نے سید کے نام اور کام دونوں کو پوری طرح

اپنالیا، تہذیب الاخلاق کا نیا اجرا کر کے! یہ سید حامد تھے جنہوں نے علی گڑھ تحریک کے سنچا لک کو ایک نئے خطاب کی چھاؤں میں لے لیا تھا: **سید والا گھر**: نام سجتا بھی خوب ہے۔

پھر علی گڑھ والوں کو یاد آیا کہ سید کی پیدائش کو دو سو سال ہونے کو آرہے ہیں اب باگ ڈور جنرل ضمیر الدین شاہ کے ہاتھوں میں تھی: دوصدی جشن بڑی دھوم دھام سے چلا؛ اب بھی چل رہا ہے۔ لگتا تو ہے کہ جنرل کو وارث بھی اچھا مل گیا۔

دوصدی جشن کی تقریب سے تفسیر سرسید پر کئی مطالعات سامنے آگئے: خود حالی (حیات جاوید) کس سے کم تھے، اُدھر خدا بخش لائبریری سے دو جلدوں میں سید کی تفسیر ایک بار پھر پچھلی طباعت کے مکمل عکسی ایڈیشن کی صورت میں بیسویں صدی کی آخری دہائی میں شائع ہوگئی۔ سید پر ایک اعلیٰ درجہ کی بھرپور کتاب بھی شائع ہوگئی تھی: سید کے حالات وافکار پر ثریا حسین کا معرکہ آرا کام!

مزید برآں تفسیر پر، یا یوں کہیے سید کی دینی خدمات پر، اسی صدی جشن کی تقریب سے ایک بھولا بسرا کام از سرِ نو سامنے لے آیا گیا؛ یہ عبدالحلیم شرر کا کتابچہ تھا: ''سرسید کی دینی برکتیں''۔

لیکن گزٹ کو لوگ بھولے رہے (استثنا: ڈاکٹر اصغر عباس، ڈاکٹر افتخار عالم اور ڈاکٹر شافع قدوائی: مگر وہ بھی جزوی!) ضرورت تھی کہ سارے مجلدات کا ایک تفصیلی، تجزیاتی اشاریہ بنایا جائے تاکہ استعمال بھی وسیع تر ہو سکے اور صحیح قدر و قیمت بھی نمایاں ہو۔

●

اس اخبار کا پہلا نمبر ۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۶ء کو نکلا جو ''بمقام علی گڈھ سید احمد پریوٹ پریس (۱۸۶۷ء میں پریس کا نام انسٹیٹیوٹ پریس ہوگیا) میں چھپ کر باہتمام منشی محمد یار خاں'' شائع ہوا، سرِ ورق پر یہ انگریزی عبارت لکھی رہتی تھی:

> Liberty of the press is a prominent duty of the Government and a natural right of the subjects.

اور اس کے نیچے اس کا اردو ترجمہ: ''آزادی چھاپہ کی، ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا، اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا''۔

۱۸۶۷ء میں یہ عبارت اس طرح ہوگئی :

To Permit the liberty of the press is the part of wise Government, to preserve it is the part of free people.

''جائز رکھنا چھاپہ کی آزادی کا، ہے کام ایک دانا گورنمنٹ کا،
اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ایک آزاد رعیت کا''

یہ اخبار انگریزی اور اردو دونوں میں نسخ ٹائپ میں چھپتا تھا، ہفتہ وار تھا، اور سالانہ قیمت ۱۵ روپے تھی۔ اس میں ہفتہ بھر کی اہم قومی اور معلوماتی خبریں، معلوماتی اعداد وشمار اور متنوع عنوانات پر دلچسپ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اخباروں سے اس قسم کی متنوع معلومات مل جاتی ہیں جن کا ادب اور تاریخ کی کتابوں میں کہیں اور کوئی نشان نہیں ملتا۔ اور یہ اخبار اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے؛ مثال کے طور پر اس کے ابتدائی فائلوں سے (۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء اور ۱۸۶۹ء) مندرجہ ذیل ہندستانی اخبارات کا ذکر مل جاتا ہے (جس سے ہندستانی اخبار نویسی کی تاریخ لکھنے والے کو کچھ روشنی مل جاتی ہے)۔

Friday Review, Delhi Gazette, Pioneer, Mufassilite, Hindoo Patriot, Indian Publice Opinion, Englishman, Native Opinion, Friend of India, Hindoo Perkash, Bengalee, Bengal Hurkara, Bombay Gazette, Reflector, Lahore Chronicle, Times of India.

دہلی گزٹ (اردو) نجم الاخبار، روہیلکھنڈ اخبار، نور الابصار، اکمل الاخبار، نیر اکبر، سہیل پنجابی، رہنمائے پنجاب، اردو گائڈ، اخبار عالم، کارنامۂ ہند، مجمع البحرین، پنجابی اخبار لاہور، لارنس گزٹ (میرٹھ) کوہ نور (لاہور)۔

☆

نوائے ادب کے مذکورہ مضمون نگار کو گزٹ کی اولیں چار جلدیں ملی تھیں یعنی ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۹ء تک۔ ان چاروں جلدوں کے بعد ۱۸۷۳ء کا مجلد بھی انھیں دستیاب ہوگیا۔ بیچ میں تین سال کا

خلارہ گیا جس میں ڈاکٹر شافع قدوائی کو (ان کے بقول) ۱۸۷۰ء کی جلد نہیں ملی؛ جو ڈاکٹر اصغر عباس کو مل گئی؛ اس لئے کہ سینئر ڈاکٹر صاحب نے تین مضمون **شذرات سید** میں نقل کیے ہیں : پہلی تحریر کا عنوان ہے ''ایک دلچسپ نظیر واسطے اہل ہند کے'' (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۸/اپریل ۱۸۷۰ء)۔ دوسری تحریر کا عنوان ہے ''لاوارث اور محتاج بچوں کی حفاظت'' (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸/اپریل ۱۸۷۰ء)۔ اور تیسری کا عنوان ہے: ''شمالی لندن کا کالجیٹ اسکول لڑکیوں کے واسطے'' (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۰/مئی ۱۸۷۰ء)۔ پڑھنے کے بعد بآسانی اندرونی شہادتوں سے پتہ چل گیا کہ یہ تینوں مضمون سرسید ہی کے لکھے ہوئے ہیں، یہ لکھنا اس لئے ضروری ہو گیا کہ متشکک ڈاکٹر شافع قدوائی تحقیق کے اس اصول پر عمل پیرا ہیں کہ بات **شک** سے شروع کی جائے تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔

☆

جہاں تک اولین چار جلدوں کا تعلق ہے، **شذرات سرسید** میں ڈاکٹر اصغر عباس نے مندرجہ ذیل تحریریں زیر بحث مجلدات سے منتخب کی ہیں جو **نوائے ادب** کو متوجہ نہ کر سکی تھیں:

۱۸۶۶ء کے مجلد سے : (۱) تمہید: اخبار علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے اجراء کے موقع پر سرسید کے تمہیدی کلمات (۳۰ مارچ)۔ (۲) سچائی (۲۰ اپریل)

(۳) اے ہندستانیوں ہوش میں آؤ اور ہماری بات سنو (۲۷ اپریل)

(۴) میسور کے راجا کا مقدمہ (۲۷ اپریل)

(۵) التماس (قحط بنگالہ پر بڑی دل سوزی سے ایک تحریر، کہ جس سے جو ہو سکے ان مصیبت زدوں کی دست گیری کریں) (۴ دسمبر)

۱۸۶۷ء کے مجلد سے : (۱) آنریبل نواب شرف الامرا بہادر (۵ جولائی)

(۲) آرٹیکل (تعلیم خانے قائم کرنے کی جو تجویز گزٹ کے مضمون نگار نے لکھی، گزٹ کی تحریر اس کی تائید میں) (۲۶ جولائی)۔ (۳) اشرفی عہد عالمگیری (اس اشرفی کی موجودگی کی اطلاع سرسید/ گزٹ کو لالہ ابھے رام سابق خزانچی کلکٹری بنارس سے ملی جو لالہ جی کی ملکیت تھی۔ گزٹ میں اس کا عکس بھی چھاپا گیا) (۶ دسمبر)۔

۱۸۶۸ء کے مجلد سے ڈاکٹر اصغر عباس صاحب نے تنہا ایک ہی تحریر منتخب کی ہے، لیکن بڑی اہم تحریر ہے، جس میں لکھا ہے :

اس سال **بنارس انسٹی ٹیوٹ (۲۰ مارچ)** کے عنوان سے ایک اہم بحث چھڑی ہے۔

''مسٹر کیمپسن ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے ورنیکلر یونیورسٹی کی تجویز پر گورنمنٹ کو اپنی رائے روانہ کرنے سے پہلے بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ممبران کی رائے اور بحث کے واسطے پیش کیا، بنارس انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری ایشور نرائن سنگھ اور شیو پرشاد (سررشتہ تعلیم) بھی موجود تھے۔ کیمپسن صاحب کا مراسلہ مضمون پڑھا گیا۔'' اس پر ہماری سوسئیٹی کے چیف آنریری سکریٹری **سید احمد خاں** نے جو بالفعل بنارس انسٹی ٹیوٹ کے ممبر ہو گئے ہیں..... گفتگو کی ..... کہ مسٹر کیمپسن صاحب نے **ایسوسی ایشن** کے مقصود کو بالکل غلط سمجھا ہے۔ **ایسوسی ایشن** کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ..... انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جاوے بلکہ **ایسوسی ایشن** انگریزی تعلیم کی نہایت طرفدار ہے..... اس کی یہ خواہش نہیں ہے کہ ان اضلاع میں انگریزی صرف بطور ایک زبان کے سکھلائی جاوے اور جملہ تعلیم و تربیت کا ذریعہ نہ گردانی جاوے''۔

سرسید نے مزید کہا : ''جو تجویز حقیقت میں اس نے کی ہے وہ ایک علیحدہ بات ہے۔ اس کی درخواست یہ ہے کہ ایک اور طریقہ تعلیم کا جو تمام تعلیم و تربیت کی ترقی کے لیے نہایت مفید تصور کیا جاتا ہے قائم اور جاری کیا جاوے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ انگریزی علوم و فنون و خیالات اور کارپردازی کے طریقوں کو ہندستانیوں میں بذریعہ ورنیکلر کے پھیلایا جاوے جس سے بجائے قلیل آدمیوں کے لاکھوں کروڑوں کو بآسانی تعلیم کا فائدہ پہنچے اور اس طریقہ کے استحکام اور کامل ترقی کے لیے اس کی درخواست ہے کہ یا تو کلکتہ کی یونیورسٹی میں ورنیکلر کا ایک شعبہ قائم ہو یا ایک جداگانہ یونیورسٹی خاص ان اضلاع کے لیے قائم کی جاوے۔ پس کہاں یہ صاف اور روشن درخواست جو ایسوسی ایشن نے پیش کیا ہے اور کہاں وہ پیچیدہ اور تاریک مضمون جو مسٹر کیمپسن صاحب نے پیش کیا ہے۔ پس **ایسوسی ایشن** کی ایسی تجویز ہے کہ اس کے اجرا سے جس قدر ذریعے تعلیم کے گورنمنٹ کے اختیار میں ہیں سب کو ترقی اور کاملیت حاصل ہوگی، نہ یہ کہ اس میں سے کچھ کم ہو جاوے گا۔ اب کہ آپ صاحبوں نے مسٹر کیمپسن صاحب کی چٹھی کی غلطی اور ایسوسی ایشن کی اصلی درخواست کا حال دریافت کر لیا تو مجھ کو امید ہے کہ اس مضمون پر آپ اس کی اصل بناء کے لحاظ سے بحث کریں گے''۔

یہ اندراج جو ڈاکٹر اصغر عباس کے شذرات سید میں ۱۸۶۸ء کے مجلد سے منتخب ہو کر آیا، اگر چہ اس سال کا یہ تنہا سیلیکشن ہے، مگر بڑی اہمیت رکھتا ہے جس سے سر سید کی دور اندیشی اور جرأت مندی دونوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جرأت کا خاص طور سے اس لئے کہ کوئی انگریز بہادر ایک تجویز لوگوں کے سامنے رکھے اور اس تجویز کی مخالفت میں ایک ہندستانی کی طرف سے پوری جرأت کے ساتھ اظہار خیال کر دیا جائے۔

۱۸۶۹ء کے مجلد سے : شذرات سید میں ۱۸۶۹ء کے سلیکشن میں بس ایک ہی تحریر ہے اس کا عنوان ہے ''ہندوستانیوں کو کو باہم محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہیے'' (گزٹ، ۲۹/اکتوبر ۱۸۶۹ء) یہ تحریر نوائے ادب کے مندرج اشاریے میں بھی شامل ہے، اس لئے زیادہ توجہ طلب نہیں۔

۱۸۷۳ء کے مجلد سے : ڈاکٹر اصغر عباس کے یہاں، مضمون بعنوان ''ہندوؤں میں ترقی تہذیب'' اخبار مورخہ ۳ جنوری کے حوالے سے منقول ہے۔ ۳ جنوری کا ایک اندراج جو **نوائے ادب** میں اس طرح ہے ''اضلع متوسط کی عدالتوں میں ناگری حروف کا جاری ہونا ۱۴ ستمبر ۱۸۷۲ء سے'' یہ تحریر اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی ڈاکٹر اصغر عباس کی منتخبہ تحریر۔ (ایک سے دو بھلے!)

یہ مقام شکر ہے کہ ۱۸۷۳ء کا گزٹ **نوائے ادب** کے مضمون نگار کے مطالعہ میں آنے تک دستیاب بھی رہا اور لائق قرأت بھی : اس امر کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ۱۸۷۳ء کی جنوری سے دسمبر تک بڑے تفصیلی انتخابات/تبصرے/ اقتباسات/ موضوعات کا تذکرہ نوائے ادب میں آ گیا ہے۔ (جو کسی سبب سے ۱۸۷۳ء کے **شذرات سید** کے منتخبات میں نہیں آ پایا۔ صرف (۱) ہندوؤں میں ترقی تہذیب (۳ جنوری) اور (۲) عورتوں کا اخبار (۴ مئی) کے دو اندراج ڈاکٹر اصغر عباس سلیکشن میں آ سکے۔ ۱۸۷۳ء کے تفصیلی مطالعہ کے نتائج، جو **نوائے ادب** کے مضمون نگار نے درج کیے ہیں ان سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ مجلد کافی ثروت مند ہے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب موصوف نے **نوائے ادب** کی طرح جو دونوں تحریریں منتخب کیں، ان کی بڑی اہمیت ہے۔

یہ اصغر عباس صاحب کا اندراج اور **نوائے ادب** کا اندراج (برائے ۳ جنوری)، ان میں یادداشتوں میں فرق کے سبب (یعنی دونوں میں سے کوئی ایک غلط تاریخ مندرج ہوگئی ہے) ہم اصغر عباس صاحب کے اندراج کو اس لئے ترجیح دیتے ہیں کہ یہ بہت اہم تحریر ہے، اور اسی لئے ہم نے اس کو اقتباساً ذیل میں نقل کر دیا ہے :

''زمانہ سب سے بڑا رفارمر یعنی مصلح امورات ہے، ہندوؤں کا حال دیکھ کر ہمیں اس قول کی تصدیق ہوتی ہے..... ہز ہینس مہاراجہ صاحب وجیانگرم کے بیٹے کی شادی، ہز ہینس مہاراجہ جے پور کے یہاں ہوئی ہے.....میز پر سب کے سامنے انواع واقسام کا کھانا چنا گیا.....اس بات کے سننے سے البتہ ہم کو افسوس ہے میز پر بجائے نفیس نفیس برتنوں کے پتوں کی رکابیاں تھیں جن کو ہندی میں پتل کہتے ہیں، اور صرف یہی ایک چیز تھی جو اس زمانے کو یاد دلاتی تھی، جب کہ دنیا کی قوموں کو برتن بنانے کا فن نہیں آتا تھا مگر ہم کو امید کرنی چاہیے کہ ہمارے ہندو بھائی اپنے دھرم کو قایم رکھ کر بہت جلد تہذیب و شائستگی میں ترقی کریں گے۔ درحقیقت ہمارے لیے اور خصوصا میرے لیے یہ بات نہایت خوشی کی ہے اس لیے کہ میں ہمیشہ یہ خیال رکھتا تھا کہ ہمارے ہندو بھائیوں میں سویلزیشن کی ترقی معہ قیام ان کے مذہب کے نہیں ہوسکتی مگر اس حال کے سننے سے جو جے پور میں ہوا مجھے یقین ہوگیا کہ میرا یہ خیال غلط تھا اور میں اپنے اس خیال کے غلط نکلنے سے بے انتہا خوش ہوا ہوں اور خود اپنے آپ کو مبارکبادی دیتا ہوں''۔

(ڈاکٹر اصغر عباس: گزٹ مورخہ ۳ جنوری ۱۸۷۳ء سے اقتباس)

دوسرا اقتباس بھی اہم ھے ، اور اس لئے ملاحظہ میں رھے:

''میری یہ سمجھ ہے کہ ہندستان میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر ایک قوم نے ترقی کی اور دوسری نے نہ کی تو ہندستان کا حال کچھ اچھا نہیں ہونے کا۔ بلکہ اس کی مثال کانڑے آدمی سی ہوگی لیکن اگر دونوں قومیں برابر ترقی کرتی جاویں تو ہندستان کے نام کو بھی عزت ہوگی اور، بجاے اس کے کہ وہ ایک کانڑی اور بڈھی، بال بکھری، دانت ٹوٹی بیوہ کہلاوے، ایک نہایت خوبصورت پیاری دلہن بن جاوے گی۔ او خدا تو ایسا ہی کر، آمین''۔

(۲) عورتوں کا اخبار (۴ مئی): ڈاکٹر اصغر عباس کے یہاں، یہ چار مئی کا اندراج، توجہ طلب ہے کیوں کہ اس اخبار اور اودھ اخبار کے مابین گڈ مڈ مضمون کے لئے دونوں حوالے میسر ہیں، ایک ان کا، دوسرا نوائے ادب کا۔ اور عنوان (عورتوں کا خبار) بھی دونوں میں مشترک ہے۔ کیوں کہ اس اخبار کا کوئی حوالہ نوائے ادب میں نہیں ہے۔ اندراج کی اہمیت کے پیش نظر چند سطریں ملاحظہ کے لائق ہیں :

''الموڑہ اخبار مطبوعہ یکم مئی ۱۸۷۳ء میں لکھا ہے کہ، جس طرح عورتوں کی تعلیم وتربیت کے لیے خاص خاص کتابیں تصنیف ہوئی ہیں اور ان سے ان کا فائدہ پہنچا ہے، اسی طرح ان کے لیے اخبار بھی خاص ایسے جاری ہونے چاہئیں جو ان کے حسب حال ہوں..... گورنمنٹ سے ایسی درخواستیں کچھ ضرور نہیں ہیں.....البتہ گورنمنٹ کی مدد ہو.....تو کوئی مضائقہ نہیں ہے..... جب ہندستان میں کوئی ایسا اخبار جاری ہوگا تو یقین کامل ہے گورنمنٹ ضرور اس کو خرید فرماوے گی اور یقیناً مدد کرے گی''۔

(ڈاکٹر اصغر عباس: گزٹ ۴ مئی ۱۸۷۳ء، بعنوان عورتوں کا اخبار)

یہ دلچسپ بات ہے کہ ۴ مئی ۱۸۷۳ء کا جو اندراج اصغر عباس صاحب نے نقل کیا ہے وہ **نوائے ادب** کے مضمون کے ذیل میں ۴ مئی کے مورخہ اخبار میں نوائے ادب میں تو موجود نہیں، البتہ ۹ مئی کے گزٹ کے اندراج کا موضوع وہی ہے، جو اصغر عباس صاحب نے ۴ مئی کے گزٹ سے اپنے شذرات سید میں نقل کیا ہے۔ موضوع یکساں ہے مگر نوائے ادب میں منقولہ اندراج جس پر گزٹ کی تاریخ ۹ مئی ہے، اس طور پر ہے:

''اودھ اخبار کی اس تجویز پر کہ عورتوں کے لئے مخصوص اخبار نکالا جائے، تبصرہ''

اب یہ اصغر عباس صاحب کا ''الموڑہ اخبار'' ہمارے مندرجہ میں ''اودھ اخبار'' کیسے ہوگیا اور تاریخیں بھی کچھ آگے پیچھے کیسے ہوگئیں، اصل گزٹ کو دوبارہ چیک کیا جائے تو شاید کچھ اس کا حل نکل آئے۔ (دیکھتے ہیں!)

(ش)

سرسید کے 'اخبار سین ٹیفک سوسئٹی، علی گڈھ' کا قدیم ترین مطالعہ

۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء

اس وقت میرے پیش نظر ابتدائی چار سال کے فائل ہیں جن میں روس وسط ایشیا، بخارا، کابل، برہما، بھوٹان، مصر، چین، ٹرکی، انگلستان، اور فرانس کے تازہ ترین حادثات وواقعات اور جنگ وصلح کی مفصل اطلاعات محفوظ ہیں، اس عہد کے بین المللی تعلقات پر ریسرچ کرنے والوں کے لئے یہ اطلاعات بے حد مفید ہوسکتی ہیں، اور معاصر ماخذ کے اعتبار سے بڑی قیمتی ہیں۔ ان چار جلدوں کی دوسری قابل ذکر چیزیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے ادبی، تاریخی اہمیت رکھتی ہیں، اور جن میں اکثر دوبارہ شائع کئے جانے کے لائق ہیں، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۸۶۶ء : پہلی جلد

''ہندستانیوں کے عیب'': منقول از انگلش مین (۶/اپریل؛ دوسرا شمارہ) برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے قیام پر سید احمد خان کا ایک طویل لکچر (۱۱/مئی) ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد ممبری کے لئے ایک سرکلر (۲۵/مئی) انگلشمین کے اس آرٹکل کا جواب جس میں ہندستانیوں کو **بے عزت ٹھہرایا گیا ہے**۔ (یکم جون)

۲۹ جون۔ انگلش مین کی اطلاع ہے کہ کلکتہ جو تقریبا ۸ میل کے رقبہ میں ہے، ۵۸ ہزار ۸ سو ۹۳ مکانات، اور ۳ لاکھ چون ہزار ۸ سو چوہتر باشندوں پر مشتمل ہے۔ جن میں ایک لاکھ ۲ ہزار ۸ سو ۹۹ مسلمان اور ۲ لاکھ اکتیس ہزار ۲ سو چھ ہندو ہیں، باقی انگریز، یونانی، چینی وغیرہ ہیں، فورٹ ولیم میں ۳ ہزار ۸ سو ۷۸ باشندے ہیں۔

۱۳/جولائی۔ ''لکچر اس بات پر کہ ہندستانی سردار اور ذی مرتبہ اور **باوجاہت لوگ اپنے رعب داب کو اپنے ہموطنوں کی بھلائی پر کس طرح استعمال کر سکتے ہیں**۔ (انگریزی سید محمد محمود نے اور اردو سید احمد خان نے سوسائٹی کی ایک میٹنگ میں پڑھا)

۱۰/اگست۔''کشمیر کا بیان'' از لاہور کرانیکل

۲۴/اگست: ''جولائی ۲۹/اگست ۱۸۶۱ء کا لکھا ہوا سرسید کا تاریخ فیروز شاہی کا دیباچہ، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں''۔

۳۱/اگست۔جزیرۂ انڈمان (منقول از کوہِ نور، لاہور)

''جزیرہ جاوا کا بیان'' از فرینڈ آف انڈیا، (۷/ستمبر) مسلمان اور انگریز ساتھ ساتھ کھا سکتے ہیں''، از سید احمد (۱۹/ستمبر، ۱۵/اکتوبر)۔''آرٹیکل اوپر حالات ہندستان کے''۔(۱۲/اکتوبر)۔

۲۳/نومبر۔مخزن العلوم، نامی ایک دو ماہی کا اشتہار جو انسائیکلو پیڈیا کے انداز پر شائع ہونے والا تھا۔منقول از اخبار خیر خواہ (پنجاب)۔

۷/دسمبر۔فرائڈے ریویو کے حوالہ سے ''کراچی'' کے ایک اخبار کا حوالہ ہے (کراچی سے نکلنے والے کسی اخبار کا حوالہ اس کے علاوہ میری نظر سے کہیں نہیں گزرا۔

۱۸۶۷ء : دوسری جلد :

۸/جنوری کے دہلی گزٹ سے ماخوذ ۱۱/جنوری کے اخبار میں وفات ''شاہزادہ فیروز شاہ'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل خبر درج ہے۔

''گورنمنٹ ہند نے معتبر سنا ہے کہ شاہزادہ فیروز شاہ نے جو دہلی کے مشہور باغیوں میں تھا اور خوبیٔ تقدیر سے ۱۸۵۷ء میں سزائے اعمال سے بچ رہا تھا، ۲۳/اگست ۱۸۶۶ء کو مقام بخارا میں بعارضۂ بخار انتقال کیا اور حضرت امام کے باغ میں دفن ہوا۔شاہزادہ مذکور نے عرب اور وسط ایشیا میں بہت کچھ سر مارا اور وہاں کے لوگوں کو سرکار انگریز کی مخالفت پر ہر چند ابھارا مگر سرکار کا اقبال ایسا یاور تھا کہ اس کی کوشش کچھ مؤثر نہ ہوئی۔آخر کو مجبور ہو کر امیر بخارا کے دربار میں جا پڑا۔لیکن قسمت کا اچھا تھا، چار روپیہ بطور پنشن پاتا رہا۔خدا کرے کہ نانا راؤ کے مرنے کی خبر بھی سننے میں آجاوے تاکہ باغیوں کی طرف سے پھر کوئی اندیشہ وخرخشہ نہ رہے''۔

۱۸/جنوری کے شمارہ میں لفٹنٹ گورنر پنجاب کی تقریر کوہ نور، لاہور، سے منقول ہے، یہ تقریر دربار عام دہلی، ۱۷/دسمبر ۶۶ء کو رئیسان دہلی کے سامنے کی گئی۔تقریر کا ایک اقتباس اہم ہے جس میں مرزا غالب کا حوالہ ہے:

''خصوصاً اس بات کے معلوم کرنے سے جس کی اطلاع مجھے ابھی ہوئی میں بڑا خوش ہوں کہ انگریزی زبان کی تعلیم کے ساتھ دیسی زبان کی بھی تعلیم ہو رہی ہے کیونکہ دیسی زبان یعنی اردو کی بولی نہایت شستہ اور شیریں اور مستند ہے جو ہر جگہ ہندستان میں تحریر و تقریر میں آتی ہے اور جس کی خوبی کی شہادت تمہارے نامی گرامی شاعر مرزا نوشہ کی شیریں تصنیفات سے (جن کو ابھی آپ کے سامنے خلعت عطا ہوا ہے) بخوبی ہے۔''

۲۹/ مارچ کے پرچہ میں عدالت دیوانی کی بابت ایک سرکاری اعلان درج ہے جس میں صدر الصدور اور منصفوں کے نام اور تنخواہیں دی ہوئی ہیں، صدر الصدور سب سے بڑا عہدہ ہے۔ کل چار صدر الصدور تھے جن میں ایک سرسید (علی گڑھ) بھی تھے جن کی تنخواہ ۸۰۰ روپے درج تھی۔

۳۱/ مئی کے پرچہ میں کشمیر پر اور مجوزہ لاہور یونیورسٹی پر دو معلوماتی طویل مضامین ہیں۔ ۱۹/ جولائی کو مدرسۂ عربی دیوبند اور اس کے کورس پر اسی قسم کا تفصیلی مضمون نکلا ہے۔ ۱۹/ اگست کی اطلاع ہے کہ ۶/ اگست کو **سرسید جج عدالت خفیفہ اور صدر الصدور بنارس** ہو کر علی گڑھ سے روانہ ہوئے ان کی جگہ راجہ جیکشن داس ڈپٹی کلکٹر علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری ہوئے۔

۱۵/ نومبر کے پرچہ میں دادا بھائی نوروجی کا ایک طویل لکچر درج ہے۔ ''گفتگو ان امور کی بابت جو ہندستان کی بہ نسبت انگلستان پر واجب ہیں'' اس جلد کے دوسرے قابل ذکر مضامین یہ ہیں:

''آرٹکل اوپر تعلیم و تربیت اہل ہند کے''، (یکم مارچ ۶۷ء) ''رشک و حسد کی حقیقت اور اس کا علاج'' (۱۰/ اپریل)، ''سوائے ذات خدا کے ہر چیز کو فنا ہے'' (۱۹/ اپریل)، ''وہ کون سی تدبیریں ہیں جن سے اہل ہند کی تربیت کو ترقی ہو اور وہ بھی مثل اور ملک کے رہنے والوں کے، ملی فخر اور امتیاز حاصل کریں (۲۷/ ستمبر)

۱۸۶۸ء : تیسری جلد :

۳/ جنوری، دہلی گزٹ کا ایک مضمون، ہندستانی مطبعوں (پریس) کی بابت سرکاری رپورٹ پر تبصرہ۔ (ملاحظہ ہو تحریک اپریل ۵۸ء جس میں یہ رپورٹ اپنی اہمیت کے سبب ہم نے تمام و کمال نقل کر دی ہے۔)

۱۰/ جنوری، ''ہندستان کے واسطے ایک ایسی گورنمنٹ کی تجویز جس میں لوگوں کی طرف

سے منتخب شخص مقرر ہو کر سلطنت کے کام انجام دیویں اور جواب دہ رہیں۔''

(تہذیب نفس، امید کی خوشی، آزادیِ رائے، قسم کا مضمون، غالباً سرسید ہی کے قلم سے)

۱۷ر جنوری، ''ورنیکلر یونیورسٹی'' کے عنوان سے ایک نوٹ جس میں لکھا ہے کہ حکومت ہماری اس تجویز پر غور کر رہی ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم بنا کر ایک یونیورسٹی شمالی ہندستان میں قائم کی جائے۔

۲۴ر جنوری، بابو دینا ناتھ گنگولی کا ایک ایڈرس ورنیکلر یونیورسٹی کے سلسلہ میں جس میں انھوں نے اردو کے بجائے سنسکرت کی تجویز رکھی ہے اس ایڈرس پر گزٹ کا تبصرہ اسی میں شامل ہے، اس کا ایک ضروری اقتباس، یہ ''دیکھانے'' کے لئے کہ انتہا پسندی کسی کی اجارہ داری نہیں ہوا کرتی (چنانچہ دینا ناتھ گنگولی کے پرزور دلائل اردو کے مقابلے میں سنسکرت کے حق میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ اقتباس سرسید کی اس روش کو دکھانے کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اپنے ہر موقف کی طرح سرسید اپنے مخالف کا طرز فکر بھی نقل کر دینا احسن خیال کرتے ہیں، چاہے یہ طرز فکر، رویہ یا سوچ ان کے عین خلاف واقع ہو، اور چاہے یہ رائے لسانی امور سے متعلق ہو یا مذہبی یا تعلیمی۔ سنسکرت بمقابلہ اردو پر اپنا موقف ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے دینا ناتھ گنگولی پر اپنے تبصرے میں لکھا ہے :

''بابو دینا ناتھ گنگولی خیال کرتے ہیں کہ علی گڑھ کی برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے اس امر کی تائید میں نہایت غلطی کی ہے کہ ان اضلاع میں دیسی زبانوں میں سے تعلیم کے واسطے اردو زبان مقدم قرار دی جاوے چنانچہ انھوں نے کہا ہے کہ جس غرض سے ہندو لوگوں نے مسلمانوں کے عہد میں ان کی زبان کو سیکھا تھا اب وہ غرض باقی نہیں رہی اور زبان اردو کے رواج سے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کو پڑھنا بالکل موقوف ہو جاوے گا اور سنسکرت چونکہ ہندستان کی اصلی زبان ہے اس لئے مناسب ہے کہ اس کو اپنے باہم مافی الضمیر کے اظہار کے واسطے ذریعہ منتخب کیا جاوے تا کہ رفتہ رفتہ سب کی ایک زبان ہو جاوے.....افسوس ہے ان کی یہ رائے صرف شاعرانہ خیال ہے جو ممکن الوقوع نہیں ہے اس واسطے کہ اب سنسکرت مردہ زبان ہو گئی ہے اور ایک مدت مدید سے اس کا ایسا رواج اٹھ گیا ہے کہ آج دو چار ہی زبان داں اس زمانے کی تاریخ کے لکھنے پر جرأت کر سکیں گے جس زمانہ میں وہ عموماً شائع تھی اور ایک پژمردہ زبان کو روزمرہ کے کاموں کے لئے شگفتہ کرنا کسی زمانہ میں نہیں ہوا.....اور بابو دینا ناتھ گنگولی نے ہمارے مذہبی جوش اور ولولے کو برانگیختہ کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے سنسکرت کے رواج دینے میں ہم سے استعانت چاہی ہے اس کی نسبت ہم افسوس سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے اصول وقواعد کے لحاظ

سے مذہبی طور پر کچھ گفتگو نہیں کر سکتے خاص ہمارا مذہب اور ہمارا عقیدہ کیسا ہی کیوں نہ ہو مگر بابت تعلیم اور معاملات ملکی میں صرف مصلحت کو اپنا ہادی جانتے ہیں اور اسی کو انصاف سمجھتے ہیں اور علاوہ اس کے ایک عام رشتے کو تسلیم کرتے ہیں جس کے سبب تمام انسانوں میں ربط واتحاد قائم ہے۔''

''شاید.....سنسکرت زبان سے ہندی مراد ہے لیکن یہ مراد ان کی تقریر سے صاف ظاہر نہیں ہے اور اگر فرض کیا جاوے کہ ان کی مراد ظاہر بھی ہے تو بھی ہندستان کے ممالک شمالی میں دیسی زبان ہونے کے لئے اردو کی ترجیح کے بہت سے کافی ثبوت موجود ہیں اول یہ کہ واقع میں دیسی زبان وہی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہندستان کی ایسی زبان ہے کہ وہی ہندستان میں آج کل کی تعلیم وتربیت کی ضروریات کو کافی ہے۔مل صاحب کی کتاب انتظام مدن، اور ویٹلی صاحب کے رسالہ منطق اور بکل صاحب کی تاریخی شائستگی یا سمین صاحب کے تراشہائے مخروطی کا ہندی زبان میں ترجمہ کرنا بھی غیر ممکن ہوگا کہ سنسکرت کے خالص لغتوں سے تائید لی جائے۔حالانکہ اردو زبان میں عربی وغیرہ کے ایسے الفاظ کا ذخیرہ ہوتا ہے جن کے ذریعہ سے علم وحکمت کے نازک نازک تفاوت نہایت اختصار سے ظاہر ہوتے ہیں۔اردو پر عوام الناس کا یہ اعتراض ہے کہ وہ ایک مخلوط زبان ہے لیکن واضح ہو کہ قدیم زمانہ کی تمام کامل زبانیں مرکب تھیں اور زبان حال کی نہایت لطیف اور کامل زبانیں بھی مرکب ہیں اور ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آئی ہیں۔اور زبانوں کے علم کے لحاظ سے ہم کو ظن غالب ہے کہ اگر ہم علم تشریح کے ذریعہ سے مرکب زبانوں کے اجزاء میں امتیاز نہ کر سکیں تو ہماری جہالت پر محمول ہوگا۔عموماً یہ غلطی شائع رہی ہے کہ مسلمانوں بادشاہوں کی فتح مندی سے اردو کا رواج لوگوں میں جبراً ہو گیا اس واسطے کہ اردو کا نام خود دلالت کرتا ہے۔ یہ زبان ایسے قواعد سے پیدا ہوئی ہے جو قدیمی اور ابدی ہیں کچھ جبراً نہیں پیدا ہوئی کیوں کہ جب ہندستانی اور مغربی قوموں سے اس میں میل جول کا اتفاق ہوا تو اردو زبان کا پیدا ہونا لابدی ہو گیا۔''

''مغربی قوموں سے ہماری مراد عربیوں اور یہودیوں اور شامیوں اور سامیوں وغیرہ سے ہے۔اور اگر بالفرض اس کے رواج میں جور وستم برتا گیا اور مانا کہ وہ کامیاب بھی ہوا، حالانکہ ایسی کامیابی کی نظیر کا کسی تاریخ میں ملنا ناممکن ہے، تو ضرور تھا کہ اضلاع شمال ومغرب میں دیسی زبان عربی یا فارسی ہوتی، اردو نہ ہوتی۔اور اردو کے شیوع کی نسبت جور وجبر کے بیان سے ہم کو ایک بات یاد آتی ہے جو ہم نے کسی اخبار میں لکھی دیکھی تھی کہ یہ زبان اس سازش کی بدولت پیدا ہوئی ہے جو گل کرائسٹ متوفی (مرحوم یا آنجہانی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، جس کے لئے انگریزی حصہ میں LATE ہے۔

ع رب)اور کسی مسلمان مولوی صاحب کے باہم اس غرض سے قائم ہوئی تھی کہ کلکتہ میں جو انگریز ہندی اردو زبان کا امتحان سول سروس کے لئے دیتے ہیں اس میں وہ بدقت تمام کامیاب ہوں.....القصہ اردو ایسی زبان ہے جس کی جانب ہندو اس وجہ سے مائل ہوتے ہیں کہ اس کی اصل ترکیب ہندی ہے اور مسلمان اس وجہ سے خواہش کرتے ہیں کہ اس کے اکثر لغات عربی ہیں اور تمام قوموں کے عالم اس کو اس وجہ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ اس میں بہت کچھ وسعت و استعداد ہے اور غیر ملکوں کے لوگ جو ہندستان میں بطور سیاسی یا بفرض اقامت آتے ہیں ان کے حق میں یہ زبان اس لئے عمدہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے تمام ملک ہند میں اپنے اغراض ظاہر کر سکتے ہیں۔''

۲۷/جنوری ''کفران نعمت برا کام ہے برے کام کا برا انجام ہے'' (غالباً سرسید کے قلم سے۔ایک ESSAY)

۳۱/جنوری ''عورتوں کی تعلیم'' (جس میں عورتوں کو گھر سے باہر تعلیم دینے کی مخالفت کی گئی ہے)

۱۴/فروری ''سفر کے فائدے''

۲۰/ مارچ دہلی گزٹ سے ''جشن پر ایک تفصیلی معلوماتی مضمون، ترجمہ کیا گیا ہے۔ مفصلائٹ سے ''راجپوتانہ کی کیفیت'' کے عنوان سے ایک بسیط مضمون کا ترجمہ۔

۲۷/مارچ، افغانستان میں سرکار انگریزی کی تدبیر مملکت۔

الور کی ریاست کا حال۔مفید خلائق اسکول علی گڈھ کی بابت ایک نوٹ (مفید خلائق اسکول نومبر ۵۷ء میں قائم ہوا خاص مضامین انگریزی اور فارسی تھے اور ۶۵ طلبا اور ۱۴ استاد تھے)۔

۳/اپریل ''میلہ **دارالسرور رام پور مقام بے نظیر**'' کے عنوان سے بے نظیر کے میلہ کا ایک اشتہار درج ہے جس میں لکھا ہے کہ ''بائیسویں ذی حجہ سے ستائیویں تک انعقادِ صحبت نشاط ہوتا ہے۔''

۲۴/اپریل۔کلکتہ یونیورسٹی سے متعلقہ اسکول اور کالج (غالباً شمالی ہندستان کے کل مدرسے اور کالج) ایک مضمون کے ذیل میں اس طرح دئے گئے ہیں، یہ اپریل ۱۸۶۸ء میں شمالی ہندستان کے انگریزی تعلیمی اداروں کی مکمل فہرست ہے:

آگرہ کالجیٹ اسکول، اجمیر اسکول، علی گڑھ اسکول، بریلی کالجیٹ اسکول، بشاپ اسکول شملہ، مشن اسکول الہ آباد، مشن اسکول جبل پور، مشن اسکول امرتسر، کیننگ کالج لکھنؤ، کانپور اسکول، دہلی کالجیٹ اسکول، گجرات اسکول، ہیوم ہائی اسکول اٹاوہ، جے پور، جھیلم، جے نرائن کالج بنارس، جلندر

مشن اسکول، لاہور ہندو اسکول، لاہور مشن اسکول راولپنڈی، ریواڑی ضلع اسکول، سینٹ جانس کالج آگرہ، سینٹ اسٹفنس کالج دہلی، انبالہ مشن اسکول، وکٹوریہ کالج آگرہ، بریلی کالج، دہلی کالج، لاہور کالج، (ان کے علاوہ ایک اور نام کوئنز کالج بنارس کا ملتا ہے)۔

''دیسی زبان کی یونیورسٹی قائم ہونے کی نسبت دہلی سوسائٹی میں مباحثہ ہوا''

یکم مئی، ایک کتاب ''حیات افغانی، تاریخ ممالک افغانستان، تالیف محمد حیات خاں'' کا دو صفحہ کا اشہار۔

انگریزوں کے مقابلے میں فرانس کے ساتھ ہندستانیوں کے دلوں میں زیادہ احترام زیادہ عزت لگتی ہے۔ کم سے کم اس خبر سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ (اور نہر سویز نکلنے میں ابھی کئی سال باقی ہیں!)

گزٹ کی ۸/مئی کی اشاعت میں : ''مصر میں **فرانس والوں کا زیادہ رعب ہے یا انگریزوں کا**'' پائنیر سے ترجمہ (نتیجہ فرانس والوں کے حق میں نکلا ہے)۔

۲۹/مئی ''پارلیمنٹ میں ہندستانی اور انگریزی حکومت کی نسبت مباحثہ''، مفصل ۶، ۷ کالمی رپورٹ۔

۵/جون ہندوؤں کے سیاح ہونے کا ثبوت۔

مصر کے بارے میں اعداد و شمار: (دہلی گزٹ سے ماخوذ)، سال گذشتہ کی خانہ شماری کے موافق، مصر کی آبادی، ۴۹۱۱۶۱۹

ان میں:	قبطی	۵ لاکھ
	بدو عرب	۴۰ لاکھ
	اسکندریہ کی آبادی	۲ لاکھ (جن میں نصف یورپین ہیں)
	قاہرہ کی آبادی	۴ لاکھ سے زیادہ

قاہرہ میں ۴۹ مدرسے، ۴۰۰ سے زیادہ مسجدیں ہیں، ۱۶۶ قہوہ خانے ہیں، ۶۵ حمام ہیں اور ۱۱ بازار ہیں۔

۱۲/جون **''ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا تتمہ''**

۱۹/جون ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا تتمہ (۲)

۲۶/جون ''دختر کشی'' تاریخی مضمون

تتمہ ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا (۳)

۱۰/جولائی۔ ''عملداری ہندستان پر ایک مباحثہ (انگریزی حکومت کے حق میں) مصنفہ محمد

عثمان خاں مدارالمہام ریاست رام پور۔

رسالہ علاج ہیضہ۔ بموجب اصول معالجہ ہومیا پیتھی، مؤلفہ سید احمد خاں۔

۱۷ر جولائی، ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا تتمہ (۴)

عورتوں کے سرکاری اسکول، ایک گوشوارہ

بنگال: ۳، بمبئی ۱۶، مدراس ۹، ممالک مغربی و مشرقی، ۴۶۱، پنجاب ۲۹۶، اودھ ۶، حصہ درمیانی ۱۳۱، اور طالب علموں کی تعداد اسی ترتیب سے ۵۵۱۹، ۴۰۳۰، ۳۱۰۹، ۱۲۰۰۲، ۲۰۵۳۴، ۳۶۶۲۔

۲۴ر جولائی ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا تتمہ (۵)

۳۱ر جولائی ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت کا تتمہ (۶)

۱۱ر ستمبر ''گارساں دتاسی'' کی کتاب کا خلاصہ جو اس نے ہندستانی زبانوں پر لکھی ہے۔

سرشتہ تعلیم سرکاری کی تعلیم کو علی العموم سب لوگ پسند کیوں نہیں کرتے۔''

۲۵ر ستمبر کیفیت ملک فارس (منقول از پنجابی اخبار)۔ ۱۳ر نومبر: قواعد سول سروس ۱۸۶۹ء۔ ۲۰ر نومبر ''ریاست جے پور کی کیفیت''۔

۴ر دسمبر ''**اپنے ملک کی گورنمنٹ میں شامل ہونے کے لئے ہندستان کے باشندوں کا استحقاق**''۔ ۱۸ر دسمبر پنجاب کی مجوزہ یونیورسٹی۔ ۲۵ر دسمبر ''فرانس کے باشندے''۔

اسی سال ۱۸۶۸ء کے کئی شماروں میں (۵ر جون، ۱۲ر جون میں) ہندوؤں کی سیاحی کے ثبوت دیے گئے ہیں۔ اور ابھی گاندھی جی ہی نہیں عام ہندستانی سماج میں ''نیک دل ہندوؤں کے ذہن میں'' سمندری سفر کے خلاف کافی جذبات پھیلے ہوئے ہیں۔

گزٹ نے چند ماہ بعد ایک بار پھر ۲۹ر اکتوبر ۱۸۶۸ء کو اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ: **ہندوؤں کو بھی انگلستان کے سفر کی جانب توجہ چاہیے۔**

O

۱۸۶۹ء : چوتھی جلد :

۱۸۶۹ء میں یہ بحث جاری تھی کہ کون سی زبان اختیار کرنی چاہیے۔

۲۲ر جنوری۔ ہندستان کی **عدالتوں میں کون سی زبان** ہونی چاہیے اس بحث پر بنارس گزٹ سے ایک مضمون کی نقل۔

۵/فروری، انگلستان کی سیر، کے عنوان سے **سید احمد خاں کے سفر انگلستان کے** ارادہ کا ذکر، سفر کا مقصد، ان کی درخواست کے خلاصہ سے ظاہر کیا گیا ہے، یہ بھی اطلاع ہے کہ **سید محمود کو وظیفہ** دے کر انگلستان بھیج رہی ہے۔

اور سید محمد محمود کے ساتھ سید احمد خاں کے چھوٹے لڑکے سید محمد حامد بھی جائیں گے۔

۵/ مارچ ''بحث اس باب میں کہ رواج تحریر اردو کا سررشتہ جات سرکاری میں بحال رہنا چاہیے یا نہیں۔

مضمون تفضّل حسین، (منقول از نورالابصار)''

اس موضوع پر ایک اور نوٹ، رتن پرکاش، سے منقول

۱۲/ مارچ، ''ہندستان میں مختلف مذاہب اور قوم کے آدمی، سوائے ماتحت ریاستوں کے،'' تخمیناً حسب تفصیل ہیں:

ایشیا کے رہنے والے:	۱۱لاکھ
بودھ مذہب والے:	۳۰لاکھ
قدیمی باشندے:	ایک کروڑ ۲۰لاکھ
مسلمان:	ڈھائی کروڑ
ہندو:	۱۱کروڑ

زبان کے مباحثہ کے سلسلہ میں، نورالابصار، سے ایک بحث نقل۔

اسی سلسلہ میں تفضّل حسین کے مضمون کے جواب میں نند کشور کا مضمون۔

۲۳/ مارچ، رسالہ تار برقی (منجملہ مطبوعات سوسائٹی) چھپنے کی اطلاع ہے، دوسری کتابیں جو زیر طبع ہیں یہ ہیں:

ٹاڈ ہنٹر کے اقلیدس کا ترجمہ از منشی ذکاءاللہ۔

جغرافیہ حصہ اول: پادری ولکنسن نے اردو میں لکھا۔ مل کا رسالہ سیاست مدن، ترجمہ پنڈت دھرم نرائن۔

''ہر کس بخیال خویش خبطے وارد۔ دراقم نیز'' اس عنوان سے زبان کے مسئلہ میں اودھ اخبار سے افتتاحیہ نقل کیا گیا ہے۔

۲/اپریل، میلۂ بے نظیر رام پور کا اشتہار۔

۱۶/اپریل، زبان کے مسئلہ پر مولوی سید وارث علی کا مضمون (منقول از سین ٹیفک سوسائٹی بہار)۔ ''**ہندی زبان کے رواج میں**، واسطے کاروبار عدالت سرکاری کے'' (منقول از آب حیات)

۲۳/اپریل، زبان مروجہ پنجاب کا حال (منقول از رسالہ جلسہ تہنیت، لکھنؤ)

۳۰/اپریل، **مسافران لندن**، اس عنوان سے سرسید کا سفر نامہ انگلستان اس پرچہ سے بالاقساط شائع ہونا شروع ہوا۔ اس حصہ میں ہندستان ہی کا تذکرہ درج ہے۔

جواب مضمون **دربارۂ اردو ناگری** مندرجہ نور الابصار نمبر ۵ مطبوعہ یکم مارچ ۱۸۶۹ء از سید مظہر حسین۔ طالب علم (منقول از نجم الاخبار)

۷/مئی مسافران لندن، ۲

۱۴/مئی ''جمیع اہل ہند کی کاربراری کے واسطے **ہندی زبان اچھا وسیلہ ہے**'' کسی گمنام کا مضمون۔ مسافران لندن ۳۔

ہندی زبان کے رواج میں۔

۲۵/مئی، تجربات برقی پر ڈاکٹر جیمس سنیر کا اردو میں ایک لکچر،

اردو ناگری کی بحث (منقول از نجم الاخبار)

۲۸/مئی، وارث علی صاحب کی ایک تقریر، زبان اردو کے بارے میں (منقول از سین ٹیفک سوسائٹی بہار)

زبان کے مسئلے پر ''مباحثہ''

۴/جون: مسافران لندن کے سلسلے میں ایک اطلاع ہے کہ ۲۴/دن میں بمبئی سے لندن پہنچ گئے، ۴/مئی ۱۸۶۹ء کو یہ بمبئی سے ۱۰/اپریل کو روانہ ہوئے تھے، ۲۹/کو مارسلیس پہنچے پہلی کو پیرس روانہ ہوئے اور تین دن قیام کے بعد لندن۔ ''غور کرنا چاہیے کہ ہندستان سے لندن اتنا بھی دور نہیں رہا جیسے کہ تیس برس پہلے دہلی سے الہ آباد تھا بلکہ دہلی سے الہ آباد آنے میں تکلیف زیادہ تھی۔''

مباحثہ ناگری و فارسی مندرجہ نور الابصار۔

۱۱/جون، مسافران لندن ۴

اردو ناگری، ایک مضمون، از سید مظہر حسن

۱۸/جون، ڈاک خانہ پر ایک مضمون، عہد بہ عہد ترقی کے لحاظ سے۔

مسافران لندن ۵

سول سروس کے امتحان لندن میں کامیاب ہونے والوں میں **چار ہندستانی** ان کے نام۔

۲۵/جون، مسافران لندن نمبر ۶

۳/جولائی، ہندستانی سول سروس (ماخوذ از اوور لینڈ میل) بسلسلہ ناانصافی از باشندگان ہند۔

راجہ شیوراج سنگھ، رئیس کاشی، کا مضمون: ''عدالتوں میں بجائے فارسی حروف کے ناگری اور انگریزی حرف جاری ہونے چاہئیں،''

مسافران لندن۔ بحث اردو ناگری کی، منقول از نجم الاخبار۔

۹/جولائی، انگریزی زبان کی تعلیم، مسافران لندن نمبر ۱۰۔

۱۶/جولائی، قواعد واسطے عام سول سروس کے، بابت سنہ ۱۸۷۰ء

مسافران لندن،

۶/اگست، علم تاریخ پر ایک مضمون۔

۲۷/اگست، **سید احمد خاں کے نام گارسن دتاسی** کا ایک خط:

''صاحب عالی قدر۔ جب سے آپ بخیر و عافیت لندن میں وارد ہوئے ہیں میں چاہتا تھا کہ آپ کو اردو زبان مین ایک خط لکھوں اس لئے کہ وہ ایسی زبان ہے جس کے آپ نہایت شائق ہیں مگر چونکہ مجھ کو اس عمدہ زبان میں تحریر کا ربط نہیں ہے صرف پڑھنا اور ترجمہ کرنا آتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ میں ہندستان میں کبھی نہیں رہا اس وجہ سے میری ہمت نے گواہی نہ دی۔ مج کو علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ سے ابھی یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ اسٹار آف انڈیا کے کمپنین مقرر ہوئے جس کے آپ حقیقت میں مستحق تھے۔ پس میں اس موقع پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ یہ صرف آپ ہی کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ اخبار مذکور الصدر میرے پاس آتا ہے اور جب کبھی اس میں ہندوؤں کی مخالفت پر جو ہندی کے جاری ہونے کے نہایت خواہاں ہیں زبان اردو کی کوئی تائید ہوتی ہے تو میں اس کے دیکھنے سے نہایت محظوظ ہوتا ہوں، کتاب توریت مقدس کی تفسیر جو آپ نے میرے پاس بھیجی ہے اس کا میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے اس کتاب کی نسبت اپنے ایڈریس میں بہت کچھ ذکر کیا ہے۔ جو کتاب آپ نے دہلی کی عمارتوں کی نسبت تالیف کی تھی میں نے اس کا بھی ترجمہ زبان

فرانس میں کرلیا ہے اور میں نے سرکاری اخبار میں آپ کے اور آپ کے سفر کی نسبت ایک اطلاع چھپنے کے واسطے بھیجی تھی چنانچہ وہ اخبار آج جاری ہوا ہے لیکن نہایت افسوس ہے کہ اکثر جگہ کمپوزیٹروں کی غلطی سے اطلاع مذکور میں بہت سی چھاپہ کی غلطیاں ہوگئی ہیں۔ چنانچہ ہندستانی کی جگہ ہندستانیوں، اور علی گڑھ کی جگہ اینٹ گڈھ درج کیا ہے مجھ کو اس سے نہایت رنج ہوا اور میں عرض کرتا ہوں کہ اخبار مذکور اتفاقاً آپ کی نظر سے گزرے تو آپ میرا قصور معاف فرمائیں۔

''میرا دوست سید عبداللہ جو ہمیشہ مجھ کو انگریزی یا اردو میں چھٹیاں لکھا کرتا ہے بیان کرتا ہے کہ یورپ میں تشریف لے جانے سے پیشتر آپ کا ارادہ پیرس میں تشریف لانے کا ہے۔ میں آپ کی ملاقات سے نہایت مسرور ہوں گا اور جو کچھ میں اب لکھتا ہوں اس کو زبانی بیان کردوں گا۔

آپ کا خادم گارسن دتاسی، از مقام پیرس، مکان نمبر ۴۳ بازر یوسینٹ اینڈ رے، مورخہ ۱۷/ جولائی ۱۸۶۹ء''

ایک تحریر میں ثبوت دیتے ہوئے ایک بحث کا دروازہ کھولا ہے (۲۷/ اگست، جو پنجابی اخبار لاہور سے منقول ہے): ''**آدم سے پہلے دنیا میں انسان** ہونے کا ثبوت''

۳/ ستمبر۔ ایک خبر: ''معلوم ہوا ہے کہ **محمد نذیر احمد** کو بعوض تصنیف کرنے ایک اردو قصہ کے جس کا نام **مرأۃ العروس** ہے مبلغ ایک ہزار روپیہ بطور انعام کے سرکار سے مرحمت ہوئے ہیں اور سرکاری کالجوں میں پڑھانے کے واسطے اس کی دو ہزار جلدوں کی خریداری کا حکم ہوا ہے۔ اس کی مفصل کیفیت ضمیمہ منقولات گورنمنٹ گزٹ کے مضمون سے معلوم ہوگی''۔

ممالک مغربی وشمالی میں تعلیم کا کیا حال ہے۔

سید احمد خاں کے نام اڈورڈ ہنری پالمر (مشہور مستشرق) کے دو خط ایک عربی میں دوسرا فارسی میں۔

ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا ذکر خیر (۲۷/ اگست کے گزٹ میں) اس طور سے ہے: ''یادداشت ان کتابوں کی جو **محمد نذیر احمد، جالون کے عہدہ دار** بندوبست نے پیش کیں'' یہ بہت دلچسپ اور کارآمد یادداشت ہے جس میں مولوی نذیر احمد، اور ان کی تصنیفات کے بارے میں مفصل کیفیت اور تفصیلی اطلاع ہے۔ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں: مرأۃ العروس، رسم الخط کتاب زبان اردو، نصاب خسرو، منتخب الحکایات، چند پند، صرف صغیر (**زیادہ تر غیر مطبوعہ ہیں جنھیں چھاپنے کی سفارش ہے**)

۱۰/ستمبر، اب تک ہندستانی لوگ عورتوں کی تعلیم میں جوش ظاہر نہیں کرتے۔

۲۴/ستمبر، ''شائستگی کیا چیز ہے''

یکم اکتوبر، ''ہندستانیوں کو سب لوگ فریبی کیوں کہتے ہیں۔''

۱۵/اکتوبر، اخبار کے خریدار ۵۲ (در ۱۸۶۶ء) سے ۲۹۳ ہو گئے ہیں اور ایڈیٹر محمد یار خاں کے بجائے مولوی محمد اسمٰعیل مقرر ہو گئے ہیں۔

۲۳/اکتوبر، ''عورتوں کو کس طریقے سے تعلیم دینی چاہیے۔''

۲۹/اکتوبر، **ہندوؤں کو بھی انگلستان کے سفر کی جانب توجہ چاہیے۔**

۲۹/اکتوبر، ہندستانیوں کو باہم محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہیے۔''

۵/نومبر، ''رشوت ستانی، پولیس کی بدانتظامی''

۱۸۶۹ء ہی میں عورتوں کی تعلیم کے سلسلہ میں گزٹ کی توجہ قابل لحاظ ہے، اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل تحریریں قابل ذکر ہیں:

۱۲/نومبر ''**شرفا کو بھی عورتوں کی تعلیم** کی جانب توجہ چاہیے''۔ (مضمون نگار کا نام ندارد؛ یا ہم نوٹ نہ کر سکے)۔

۱۹/نومبر، سفر لندن کے بارے میں ایک طویل خط (از سید احمد خاں) ۱۵/اکتوبر ۶۹ء، از لندن) ''یونیورسٹی کے سند یافتہ شخصوں کی آئندہ کیا حالت ہوگی'' **جو آج ہے** یہی اس میں بتایا گیا ہے۔''

۲۶/نومبر، **سید احمد خاں کا ایک خط، عورتوں کی تعلیم پر**، پچھلے شمارہ کے ایک آرٹکل کے بارے میں۔

۳/دسمبر، امرائے ہندستان کو اپنی اولاد کی تعلیم کی جانب متوجہ ہونا چاہیے۔

نورالابصار نے **سید احمد خاں کے بارے میں ایک سخت ناقدانہ نوٹ** لکھا ہے وہ مکمل نقل کیا گیا ہے۔

۱۷/دسمبر، ''اپنے ہمجنسوں کے ساتھ ہمدردی کرنا انسانیت ہے۔''

۲۴/دسمبر، اخبار شعلۂ طور میں سید احمد خاں اور سوسائٹی کے بارے میں **ایک سخت تنقیدی خط نکلا اس کو مکمل نقل** کیا گیا ہے اور اس کا جواب بھی دیا گیا ہے، تنقید سید امداد العلی کی ہے۔

☆

سرسید کا 'اخبار سین ٹیفک سوسئٹی، علی گڈھ'

۱۸۷۳ء

۱۸۷۳ء : آٹھویں جلد :

۱۸۷۳ء میں گزٹ کی آٹھویں جلد شروع ہوئی، ۱۸۷۰ء ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء کی فائلیں مجھے ابھی تک نہیں مل سکی ہے۔ لیکن ان کی خاطر گزٹ کے جو فائل فی الحال میسر آ سکے ہیں ان کی پیشکش میں تاخیر میں مناسب نہیں سمجھتا۔ ہر سال کے مندرجات میں خاصی معقول تعداد میں اتنی اہم چیزیں مل جاتی ہیں جن کے اشاریہ کی پیشکش میں عجلت ضروری بھی ہے، مفید بھی۔

۱۸۷۳ء کے گزٹ میں جو اہم مندرجات ہیں انھیں میں نے تاریخ وار درج کر دیا ہے، آپ انھیں نیچے کی سطروں میں ملاحظہ کر لیں۔ ویسے اس سال کی اہم ترین تجویز اور اس سلسلے کی تحریروں کا حوالہ اپنی جگہ پر تاریخ وار دینے کے بجائے یہ بہتر خیال کیا کہ آپ سے تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے یہیں اس کا تذکرہ کر دوں۔

تجویز یہ تھی کہ ''انگریزی اخبار'' ہندستانیوں کی رایوں کا ترجمہ چھاپہ کرے، ۲۸ر فروری کے گزٹ کے اداریہ میں اس عنوان سے یہ تجویز پہلی بار پیش کی گئی، ''تجویز، ایسے حالات میں جب انگریزوں کو یہ سمجھانا قطعاً ضروری تھا کہ ہندستانیوں کی ان کے انتظام وانصرام کے بارے میں کیا رائیں ہیں'' کیسی اور کتنی مفید تھی اور کتنے دوررس نتائج کی حامل تھی، اس پر طویل گفتگو فضول ہے۔ اس گزٹ نے اس تجویز پر جو تبصرہ کیا ۲۱ر مارچ کی اشاعت میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور ۳ر مئی کے پرچے میں، پایونیر وغیرہ اخبارات نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کا عنوان ہے، ''ہندستانیوں کی رایوں کا کیا حال ہے۔ اودھ اخبار نے اپنے ایک اداریہ میں اس تجویز پر اظہار خیال کیا، اینگلو انڈین اور اردو اخباروں میں اس تجویز کا عام چرچا قابل لحاظ ہے۔ ویسے گزٹ کی موجودگی میں جو انگریزی اردو دونوں زبانوں میں چھپتا تھا۔

خودگزٹ والوں کے لئے تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس قسم کا ایک اور اخبار نکال ڈالتے، کسی اور کو اتنی توفیق نہ ہوئی، تجویز میں کتنی دور اندیشی اور دانشمندی، کتنی سیاسی سوجھ بوجھ اور بصیرت پنہاں ہے، آج نوے برس کے بعد بھی ایک ایسے انگریزی اخبار کی ضرورت ہے جو صرف اردو پریس کی رایوں کا خلاصہ پیش کر دیا کرے، اور ان اہم خبروں کا ترجمہ کر دیا کرے جسے انگریزی پریس نظر انداز کر جاتا ہے۔ یہ اوور بات ہے کہ آج ایسا اخبار تو کجا ہمارے پاس گزٹ جیسا کوئی اخبار تک موجود نہیں، ایسا لگتا ہے جیسے سائنسی اکتشافات کے سوا ہر فکری میدان میں ہم اپنے پیش رو دیوزادوں کے مقابلے میں بونے بنتے جارہے ہیں۔

ایسی پیاری تجویز پیش کرنے والوں کے سامنے میں ادب سے اپنا سر جھکاتا ہوں۔ اور ان کی خدمت میں عقیدت کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ اتقوا بفراسة المومن:

۱۸۷۳ء کے گزٹ سے جو اہم اندراجات ہمارے انتخاب میں آئے، اب وہ ملاحظہ فرمائیں:

''ہم کو اس خبر کے سننے سے افسوس ہے کہ آئندہ **ہندور فارمر**، بمبئی، موقوف ہو جاوے گا''، (۳ جنوری)

''اضلاع متوسط کی عدالتوں میں ناگری حروف کا جاری ہونا، ۱۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۲ء سے (۳ جنوری)

''سید حسین صاحب، پروفیسر عربی، کیننگ کالج، لکھنؤ نے دیسی زبان کے واسطے علمی اصطلاحات کی نسبت ایک رسالہ چھاپا ہے۔ مصنف کتاب نے جس مشکل کا ذکر کیا ہے، یعنی یہ کہ انگریزی زبان کے علمی الفاظ کے واسطے ہم معنی اصطلاحات دیسی زبان میں موجود نہیں ہیں، وہ حقیقت میں ایک بڑی مشکل ہے، لیکن اگر سید صاحب کی رائے پر عمل کیا جاوے تو وہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے، جس کا حل ہونا ناممکن ہو۔ یہ مشکل صرف اس صورت میں خاطر خواہ رفع ہو سکتی ہے کہ یکساں الفاظ استعمال کئے جاویں چنانچہ اسی غرض سے یہ رسالہ تیار کیا گیا ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ڈاکٹر ہنٹر صاحب اس رسالے کو ملاحظہ فرمادیں گے۔'' (۱۰ جنوری)

''صائب کا مقولہ اور آگرہ اخبار:

''صائب جو کہ ایک عالی دماغ اور نازک خیال شاعر تھا، جب اس نے یہ شعر کہا جس کا ایک مصرع یہ ہے :

''جامہ رافاختۂ ساختۂ یعنی چہ :

''تو اس کے اس بے نظیر شعر کا نہایت شہرہ ہوا اور جو اس مذاق کے لوگ تھے اور اس نازک دماغی کے قدر شناس تھے۔ انھوں نے صائب کی نہایت مدح کی۔ رفتہ رفتہ یہ شعر ایک ایسے مدرسے میں بھی پہنچا جس میں ایک شاخ عربی کی بھی تھی، وہاں کے طلباء نے جب اس شعر کو سنا تو کوئی اس پر ہنسا، کسی نے اس پر کوئی اعتراض کیا، کسی نے اس کو مہمل بتایا، غرض کہ آخر کار یہ شعر مدرسے کے مدرس اول کے پاس گیا، انھوں نے کمال ذہانت اور نہایت جودت طبیعت سے ہنس کر یہ فرمایا کہ ''صائب خطا کرد، چرا کہ خطاب را بصیغۂ غائب تعبیر نمود؛ در شعر لفظ ''یعنی'' کہ بیائے تحتانی است بتائے تحتانی می باید کہ مقام خطاب است۔ اس اصلاح کی خبر صائب کو بھی پہونچی اور تمام مراتب، جو اس شعر فہمی میں عربی کی شاخ کے طلباء سے حائل ہوئے تھے، سب صائب کے روبرو بیان کئے گئے۔

''صائب نے جب معلوم کیا کہ میرے بے نظیر شعر کی مٹی خراب ہوئی تو وہ بیچارہ رویا اور متاسفانہ اس نے کہا کہ 'افسوس شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد'۔ یہی کیفیت ہم کو اس وقت آگرہ اخبار مطبوعہ ۲۰ دسمبر میں ان تحریروں کے دیکھنے سے آرہی ہے جو **مدرسۃ العلوم** کی بابت ہیں۔ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مدرسۃ العلوم کی روئدادیں اور جناب مولوی **سید احمد خاں** صاحب کی سنجیدہ رائیں آگرہ اخبار کے دفتر میں کسی نے پہنچا دیں تو بھی ہم کو کچھ کم افسردگی نہیں ہوئی۔ جس شخص کی یہ تحریریں ہیں، وہ اپنے آپ کو بے تکلف غریبوں کا ہمدرد بتاتا ہے اور اپنے تمام مضمون میں لکھتا ہے کہ غریبوں کو اس مدرسے سے کیا فائدہ ہوگا؛ اور اس کو اس بات سے بڑی مایوسی ہے کہ مسلمانوں کی فقہ، حدیث، تفسیر سے بھی غریب بے چارے محروم ہو جاویں گے، صرف امراء ہی بہرہ یاب ہوں گے۔ مگر ہم اس بات سے نہایت خوش ہیں کہ ظاہرا اس میں اصل مدرسے کی تدبیر کی نسبت کوئی طعنہ نہیں ہے.....'' (۱۰ر جنوری)

''بالفعل گورنمنٹ کی یہ رائے ہوئی ہے کہ ہر ضلع کے صدر محکمہ میں ایک ایک کتب خانہ قانون کی کتابوں کا قائم کیا جائے.....'' (۱۰ر جنوری)

''تتمہ مضمون تہذیب الاخلاق''، منقول از پٹیالہ اخبار (۱۷ر جنوری)

''اس بات پر اظہار مسرت کہ گزٹ میں سنہ ۱۸۷۰ء میں جن انگریزی کتابوں کی فہرست

چھپی تھی، اس ذیل میں کہ علی گڑھ اور بہار سین ٹیفک سوسائٹیوں کی طرف سے اس کے اردو ترجمے ہونے تھے، اور ہوئے، ان کی کتابوں کے بارے میں گورنر جنرل نے بنگلہ، ہندی اور اڑیا میں بھی ترجمہ کی سفارش کی ہے، گزٹ کا حوالہ دیتے ہوئے۔ (۱۴/فروری)

پایونیر سے منقول:

یہ جو عمدہ کام سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ نے تجویز کیا تھا وہ اب نہایت ترقی پر ہے، بنارس سے ہمارے پاس یہ خبر آئی ہے کہ جو اجلاس مجلس خزانۃ البضاعۃ کا ۱۰/فروری کو ہوا تھا اس مین منجملہ ۵۳ ممبروں کے اتفاق رائے سے یہ بات تجویز ہوئی کہ کالج مجوزہ **علی گڑھ میں قائم کیا جاوے**.....'' (۲۱/فروری)

''جو کتاب مسٹر اسٹینلی صاحب، ہیڈ ماسٹر ہائی اسکول الہ آباد نے انگریزی سے اردو میں اور اردو سے انگریزی میں ترجمہ کی مہارت پیدا کرنے کے واسطے لکھی ہے.....اس قسم کی کتاب کی آج کل نہایت ضرورت تھی.....'' (۲۱ فروری)

''**انگریز لوگ اس ملک کے باشندوں** سے کیوں نہیں ملتے جلتے:

غازی پور میں ایک لیکچر گزٹ میں ہی انگریزی اردو دونوں زبانوں میں ہے، (۱۴/مارچ)

''طریقہ تعلیم وسلسلۂ تعلیم جس طرح پر مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان میں ہونا چاہیے۔ مجوزۂ سید محمد محمود، ممبر، مجلس خزانۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم المسلمین'' (۲۱ مارچ)

''کلکتہ یونی ورسٹی کے کونو وکیشن کی مفصل روداد'' (۲۸/مارچ)

''رفع الزام'' محمد عارف کا خط **سید احمد خان کے مضمون کے سلسلے میں** (۱۱/اپریل)

''**کسی قوم سے باہمی میل جول کے لئے اتحاد مذہبی کیا ضروری ہے**'' (۱۱/اپریل)

''دارالعلوم مسلمانان، منقول از تہذیب الاخلاق'' (۲۸/مارچ، ۱۱/اپریل)

''دنیا میں صرف شہرت ہی نیکی کا صلہ ہے'' از کاشی ناتھ (۱۸، اپریل)

''قول فیصل، **سید احمد خان کے باب میں**'' از احمد خان صوفی۔ مہتمم مطبع مفید عام آگرہ (۱۸/اپریل)

''گزرا ہوا زمانہ'' (منقول از تہذیب الاخلاق) از این۔ ایم۔ سید احمد۔ (۱۸/اپریل)

''بحث وتکرار // // (۱۸/اپریل)

''صاحبِ **اودھ اخبار کے خیال پر تعجب** (۲۵/اپریل) اس سلسلے مین کہ سید احمد خان کے ساتھی ان کی جملہ رایوں سے بلا سوچے سمجھے اتفاق کرتے ہیں۔

''**پایونیر سے سید احمد خاں کے قیام بنارس** کی ایک رپورٹ'' منقول (۲۵/اپریل)

''خیوا، اوراس کے باشندوں کا بیان'' (۲۵/اپریل)

''اودھ کو اضلاع شمال ومغرب کے ساتھ ملا دیا جائے، اس تجویز کی عام طور سے مخالفت کے خلاف گزٹ نے موافقت کی ہے''، (۲/مئی)

''مدرسۃ العلوم مسلمانان'' کے سلسلے میں لاہور سے ایک خط (۲/مئی)

''اودھ اخبار کی اس تجویز پر کہ عورتوں کے لئے مخصوص اخبار نکالا جائے، تبصرہ'' (۹/مئی)

۹/مئی: ''دیسی زبانوں کی قابل پسند کتابوں کے مصنفوں کو انعام: بلحاظ اشتہار گورنمنٹ.....مورخہ ۲/اگست ۱۸۶۸ء''

جناب لفٹنٹ گورنر بہادر اعلان فرماتے ہین کہ ۲۹/کتابوں کے لئے انعام مرحمت کئے گئے جن کی کل تعداد ۵۵۵۰ روپے ہیں، **کتابیں جو انعام کے لئے منتخب کی گئیں** ان کی تفصیل حسب ذیل ہے :

اخلاق اور مضامین مختلف: ۸، تعلیم (عام) ۲، تعلیم نسواں ۵، ریاضی ۲، ہیئت ۲، طبیعات ۲، ناٹک ۲، تاریخ اور جغرافیہ ۴، علم حیوانات ۱، حفظ صحت اور صفائی ۱، کل ۲۹،

اردو: رسالہ علم ہیئت (مولوی صمصام الحق) ۲۔ داستان دانش آموز، حوادث سماوی وارضی کی ابتدائی کتاب (عبید اللہ العبیدی، ہوگلی کالج) ۳۔ ریاضی کے ۲۴ رسالے، سلسلہ وار (ذکاءاللہ میور کالج۔ الہ آباد) ۴۔ صبح صادق: اخلاق کا اردو رسالہ (کالکا پرشاد، کانپور) ۵۔ تلخیص الفوائد: رسالہ زبان فارسی کے بیان مین ۶، محبوب القلوب: تعلیم اور کسرت وغیرہ کے فوائد کے لئے باب میں (بشیشر پرشاد، گانپور) ۷۔ تنبیہ التعلیم (محمد مبارک اللہ، متھرا) ۸۔ تشریح الفرس، (اجودھیا پرشاد، بریلی کالج) ۹۔ تہذیب المبتدی: قصے کہانیاں، نصیحت آمیز، ترجمہ انگریزی (کشن لعل) ۱۰۔ کحل الجواہر: حفظ صحت اور صفائی وغیرہ کے بیان میں (مصلح الدین آگرہ) ۱۱۔ رسالہ فیض عام: علم ہیئت کا ایک رسالہ، عام فہم (سید تہور علی الہ آباد) ۱۲۔ تعلیم نسواں: ہنود عورتوں

کی تعلیم کے بارے میں، (چتر بھوج سہائے آگرہ) ۱۳۔ مخزن العلوم، رسالہ در باب خواص ذاتیہ اجسام وحرکت وجرثقیل وغیرہ۔ (للتا پرشاد، کانپور) ۱۴۔ تعلیم النساء (دیبی پرشاد، اجمیر) ۱۵۔ گلدستہ آداب: ادب کی حکایتیں (دیبی پرشاد اجمیری) ۱۶۔ آئینہ خرد: کی تعلیم اوران کے کاموں کے بیان میں، (عبدالرحیم آگرہ) ۱۷۔ مرأۃ الایشیاء: جغرافیہ (کلیان رائے، میرٹھ) ۱۸۔ وقائع درانیاں: ترجمہ ایک فارسی کتاب کا (سید احمد، نارمل اسکول، دہلی) ۱۹۔ ماثر النساء: ترجمہ کسی کتاب کا (تفضّل حسین آگرہ) ۲۰۔ اردو ترجمہ ''بٹلر صاحب'' کے رسالہ اثبات بہ دلالت مطالع، حصہ اول (ولیمس سینٹ جان، آگرہ)، ۲۱۔ رونق ہند: فوائد حکومت انگریزی (حسین علی مرزا پوری) ۲۲۔ منہاج السعادت (تعلیم نسواں (وزیر علی بریلی)۔

ہندی: سچی بیرتا: ترجمہ ایک رسالہ اردو سچی بہادری کا (پنڈت رام نرائن بریلی) ۲۔ استری بچار: اخلاق کی باتیں (ہری ہر ہیرالعل۔ میرٹھ) ۳۔ بھوگول، ضلع اٹاوہ (دیبی دین، تحصیل لکھن) ۴۔ بھوگول چندرادے: جغرافیہ عالم (دولت رام، کاسگنج) ۵۔ گنت چندرادے: علم حساب میں (چمن لعل، کاسگنج) ۶۔ اتر رام چرتر: ایک سنسکرت ناٹک کا ترجمہ (پنڈت دیودت، بریلی کالج) ۷ وکرم اروسی: ترجمہ سنسکرت ناٹک کا (رام پرشاد تیواری، الہ آباد)

انعام کی کل رقم: اردو: ۴۵۰ روپے، ہندی: ۷۰۰ روپے

اس کے بعد آئندہ سال کے لئے انعامات کا اشتہار ہے جس میں یہ بھی لکھا ہے کہ:

''اس غرض سے جو کتابیں ترتیب دی جائیں وہ تصنیف ہوں یا تالیف، حتی کہ اگر کسی دوسری زبان کی کتاب کا ترجمہ ہے وہ سب منظور ہوں گی۔ مگر مذہبی کتابیں جن میں تہذیبِ اخلاق کے خلاف کوئی بات لکھی ہو قبول نہ ہوں گی۔ سوائے اس کے اور کوئی قید مطالب یا طرز کی نسبت نہیں ہے۔ مضمون کتاب کا خواہ علم تواریخ سے متعلق ہو، خواہ مشہور لوگوں کے تذکرے سے یا سیر وسفر کے حالات سے، یا کسی علم وفن یا فلسفہ سے؛ اوران میں واقعی سرگزشت ہوں یا خیالی اور فرضی، اور نظم میں لکھی جائیں یا نثر میں، صرف غرض یہ ہے کہ کتاب سے کوئی عمدہ غرض حاصل ہو، چاہے تعلیم کی نسبت ہو یا تفریحی یا تہذیب عقل وادراک کی نسبت میں، اوراس ملک کی **مروج زبانوں میں اردو یا ہندی** میں لکھی جائے اور مطلب اور عبارت دونوں میں خوبی ہو..... ہندستان کی مستورات کے پڑھنے کے لائق جو کتابیں ہوں

گی وہ خاص کر پسند اور قبول کی جائیں گی''۔(۹رمئی)

''آرٹیکل'' :

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نہ شد
چوں چراغاں شب مہتاب بیجا سوختیم

''اس شعر کی دردناک صدا ہم کو آج کل **مولوی سید احمد خان** صاحب کی زبان حال سے آتی ہے اور ہم تو بشر ہیں پتھر بھی ایسی درد آمیز آواز کو سن کر کبھی پگھل جاتا ہے.....''(۱۶رمئی)

''اودھ اخبار مورخہ ۶ مئی میں مولوی نور الحق کا ایک خط مدرسۃ العلوم کے قیام کی مخالفت میں چھپا ہے اسی پر یہ آرٹیکل لکھا گیا ہے''۔

''تعزیت نامہ محمد عثمان خاں، مدار المہام ریاست رامپور جو ۱۰رمئی سنہ ۱۸۷۳ء مطابق ربیع الاول ۱۲۹۰ھ راہی ملک بقا ہوئے'(۱۶رمئی)

''درخواست بخدمت مہاراجگاں وراجگاں ونواباں وسرداراں و ایڈیٹراں واہل علم دخیر خواہانِ ہندستان'' اس عنوان سے **کیشب چندر متر** نے تفصیل سے ملکی ترقی کے لئے ایک پلان پیش کیا ہے جس میں فنون مفیدہ کی تعلیم (پروفیشنل ایجوکیشن)، ہندستانی طلباء کو انگلستان بھیجنا اور دیسی زبانوں میں انگریزی سے فنون مفیدہ پر کتابوں کے ترجمے پر زور دیا ہے۔(۱۶رمئی)

''ہندستان کی پرانی رسمیں'' از پادری رجب علی، او.ایس.ایچ (۱۶مئی)

وفی السماء نجوم لاعداد لها
ولیس یکسف الا الشمس والقمر
وکم علی الارض من خضر ویابسه
ولیس یرجم الا ما هو الشجو

یہ دو شعر عربی کے بلا شبہ مولوی سید احمد خان صاحب کے حسب حال ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے کہ آسمان میں ستارے بہت سے ہیں مگر گہن لگتا ہے تو صرف چاند اور سورج ہی کو لگتا ہے، اور گو دنیا کے پردے پر خشک گھاس پھوس بہت ہے، مگر پتھر بارود درخت ہی کو مارتے ہیں.....اداریہ (۲۳مئی)

''**مولوی سمیع اللہ خان**، علی گڑھ کے صدر الصدور مقرر'' (۲۳مئی)

''**ریویو کیا چیز ہے**'': از کاشی ناتھ (۲۳ مئی)

''حسن بن عبداللہ، (حیدرآباد کا ایک خط **مجوزہ مدرسۃ العلوم مسلمانان** کے بارے میں''۔ (۲۳ مئی)

مسٹر روتاج سابق ایڈیٹر فرینڈ آف انڈیا کے ایک مضمون مطبوعہ میکملن (لندن) کا ترجمہ بہ عنوان ''ہندستان میں بالفعل انگریزوں کی کیا حالت اور غالباً آئندہ کیا حالت ہوگی'' (۲۳ مئی)

''**ہندستانی اخباروں کا ترجمہ اور مہتمم پایونیر اخبار کی رائے**'' (۲۳ مئی)

اخبار عالم سے ''گورنمنٹ رپورٹر'' کے عنوان سے ایک مضمون منقول، جس مین **گورنمنٹ کے اس رویہ پر نکتہ چینی کی ہے کہ**:

''گورنمنٹ ہند کی طرف سے الہ آباد میں ایک صاحب عہدہ درارجن کا لقب گورنمنٹ رپورٹر ورنیکلر اخبارات ہے، مقرر ہیں۔ ان کے ذمے یہ کام ہے کہ جو مضمون نسبت امور انتظامی ملک ہند کے لائق اطلاع گورنمنٹ کے ہو اس کا ترجمہ اخبارات ممالک مغربی اور پنجاب اور اودھ اور سنٹرل پراونسیس سے کرتے ہیں۔ اور وہ ترجمہ بطور رپورٹ انگریزی اخباروں کے چھاپے کے دفتروں میں تو جاتی ہے **مگر کسی ہندستانی چھاپہ خانے کے اخبار کو نہیں ملتی ہے**''۔ (۲۳ مئی)

''ہندستان کے اخبار'' کے عنوان سے اداریہ (۳۰ مئی)

''مکتوب سرسید بنام راجہ جے کشن داس مورخہ ۹ جون ۱۸۷۳ء''

اخبار کی پالیسی اور اودھ اخبار سے گزٹ کے جھگڑے کے بارے میں (۳۰ مئی)

''نیشنل انڈین ایسوسی ایشن، لندن''، (۱۳ جون)

''ہندستانیوں کے نکاح وغیرہ کے معاملات کے تصفیہ کے واسطے قاضیوں کا تقرر (۱۳ جون)

''**جلسہ عظیم آباد، پٹنہ، واسطے ترقی چندہ مدرسۃ العلوم مسلمانان**، اسپیچ، ستارہ ہند مولوی سید احمد خان'' (منقول از تہذیب الاخلاق (۲ جون)

''بمبئی میں ایک عالی ہمت ہندو نے دیا سلائی بنانے کا کارخانہ جاری کیا ہے۔'' (۲۷ جون)

''**رزولیشن گورنمنٹ ہند بابت تعلیم ہندستان**، جو ہندستان کی رعایا **خصوصاً مسلمانوں کے حق میں** نہایت ہی اطمینان کا باعث ہے.....'' (۲۷ جون)

''مکتوب سرسید بنام راجہ رام جے کشن داس'': سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں۔ (۲۷ جون)

''مدرسۃ العلوم مسلمانان اور ستارہ ہند مولوی سید احمد خان بہادر'': اس عنوان سے گجرات کے اخبار نویسوں کے خیالات: از نجف علی (۴/جولائی)

''مدرسۃ العلوم'' (۴ جولائی)

''عوام کالانعام کے خیالات اور روس وانگلستان کے حالات'' (۴/جون)

''**سود کی ڈگریوں کی بدولت غربا کی تباہی**'' اداریہ (۱۸/جولائی)

''ممالک مغربی وشمالی کی دیسی زبان'' پایونیر سے منقول (۱۸/جولائی)

''مدرسۃ العلوم مسلمانان'' سرکلر مجلس خزنۃ البضاعۃ مدرسۃ العلوم (۱۸/جولائی)

''سید نصرت علی کی انگریزی، اردو سکھانے والی کتاب'' مفید عام پر تبصرہ'' (۲۵/جولائی)

''بنگالہ میں مذہب عیسوی کے بارے میں ایک خط از بنگالی'' (یکم اگست)

''تجویز قیام صدر انجمن مسلمانان پنجاب ماتحت خزانۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ العلوم''، نقل خط سید احمد خان بنام محمد برکت علی خاں آف پنجاب، ونقل خط سید احمد خان بنام محمد حیات خان بہادر نجم الہند، ونقلِ خط جناب محمد حیات خان، بنام برکت علی خان: منقول از اخبار انجمن پنجاب۔ (یکم اگست)

''**مہاراجہ پٹیالہ کی فیاضی کا شکریہ اور مسلمانوں کی 'غیرت' پر افسوس'': مہاراجہ نے مدرسۃ العلوم کے لئے تین سو روپے دیے ہیں** (۸/اگست)

''اخبار نویسوں کی آزادی کیا چیز ہے''۔ (۱۸ اگست)

''امید کی خوشی'': از تہذیب الاخلاق (۸/اگست)

''عرضی باشندگان ممالک مغربی وشمالی بدرخواست **اجرائے حروف ناگری** بجائے حروف فارسی'' (۱۵/اگست)

''تبصرہ، کتاب الراحۃ الموسوم الی معرفت مالطا وکشف الغطا عن فنون اوربا، مؤلفہ ۱۲۷۹ھ، ۱۲۸۳ھ، تونس (عربی) (۲۲/اگست)

''اشتہار کتاب حمایت الاسلام، مصنفۂ گاڈ فری ہگنس، **جسے سید احمد خان نے اردو میں** ترجمہ کرا کے مطبع صدیقی بریلی سے چھپوایا ہے، سید احمد خان سے مل سکتی ہے''۔ (۲۲/اگست)

''اخبار کی بے وقعتی کے اسباب'' اداریہ (۲۹/اگست)

''گورنمنٹ کا برتاؤ، ہندستانیوں کے ساتھ'' از کے، این (۲۹/اگست)

''رامپور کے نواب کلب علی خان کی تصانیف **قندیل حرم** اور شگوفہ خسروی پر نوٹ'' (۵/ستمبر)

''حکیم احسن اللہ خان رئیس دہلی کے انتقال کی اطلاع''، اکمل الاخبار سے منقول (۵/ستمبر)

''**علی گڈھ میں مسلمانوں** کی ترقی کے آثار'' (۵/ستمبر)

''الہ آباد میں **بھیڑیوں میں پلنے والا لڑکا**'' (۱۹/ستمبر)

''لفٹنٹ گورنر بنگال، اور صوبہ بہار کے مسلمان''، (۱۹/ستمبر)

''**کشمیری زبان اردو میں سیکھنے کے لئے** پنڈت بشن نرائن کی کتاب گلزار کشمیر'' (اس پر تبصرہ) (۱۹/ستمبر)

''بابو پیارے لال، خیر خواہ شمالی ہندستان از کاشی ناتھ (۱۹/ستمبر)

''پایونیر میں ایک صاحب نے اطلاع دی ہے کہ انھیں بچھو نے کاٹا تو اسی جگہ انہوں نے ایک مکھی مار کے لگادی، فوراً آرام ہوگیا'' (۲۶/ستمبر)

''کتاب اخلاق محمدی مصنفہ مرزا محمد علی''۔ (۳/اکتوبر)

''تعلیم کی طرف مسلمانوں کے خیالات'' از تصدق حسین (۳/اکتوبر)

''**اجلاس سب کمیٹی مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ۔ سکریٹری سمیع اللہ خان**'' (۱۰/اکتوبر)

''کیا مذہب کی بات بھی کسی کے خیال سے کچھ یوں ہی ہوسکتی ہے''۔ اداریہ (۳۱/اکتوبر)

''سلطنت انگلیشیہ'' : تنقید از عطا محمد، امرتسر (۳۱/اکتوبر)

''مسودہ قواعد: سکونت و تربیت طالب علماں **مدرسۃ العلوم میں**'' **از سید احمد خاں** (۳۱/اکتوبر)

''**انگریزوں کا، ان کو سلام نہ کرنے پر، ناخوش ہونا۔ اس پر سخت تنقید**۔'' (۷/نومبر)

''تعلیم کی کمیٹیاں اور سررشتہ تعلیم'' از مشتاق حسین (۷/نومبر)

''مکتوب نصیر الدین سکریٹری انجمن مناظرۃ الحکمت مرزا پور''، محسن الملک نے مرزا پور میں ایک لکچر دیا، اس کی روداد (۷/نومبر)

''امداد الاخلاق برخلاف تہذیب الاخلاق رسالہ، از **حاجی امداد العلی، ڈپٹی کلکٹر**، کانپور، پر تبصرہ'' (۷/نومبر)

''**فتاویٰ برخلاف تہذیب الاخلاق، اس مجموعہ فتاویٰ پر تبصرہ**'': منقول از کوہ نور (۱۴/نومبر)

''مسٹر میل دل صاحب کا قبولِ اسلام، ہندستان میں حکومت کے ایک افسر کے قبول اسلام پر تبصرہ، اور اظہار مسرت، منقول از کوہ نور (۲۱/نومبر)

''ریویو کتاب فسانہ حامد مصنفہ سید غلام حیدر خاں'' (۲۸/نومبر)

اسی کتاب پر رجب علی کا مضمون (۲۸/نومبر)

''**مدرسۃ العلوم کے بارے میں سید احمد خان، مولانا عبدالحق، خط و کتابت**'': منقول از اخبار انجمن پنجاب، (۲۸/نومبر)

''ریویو گلزار ہندی (اخلاق پر) مصنفہ رائے کنہیالال، لاہور، (۵/دسمبر)

ریویو رقعات نامی مصنفہ حکیم الدین لکھنؤ'' (۵/دسمبر)

''**آگرہ میں گورنر جنرل** کی آمد اور اس موقع پر پیش کئے گئے ایڈریس'' (۵/دسمبر)

''پایونیر کی خبر کہ الہ آباد کے مسلمانوں کے جلسے میں یہ طے ہوا کہ سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں **حروف دیوناگری کے اجراء کی نسبت** جو ایک عرضی فرقہ ہنود کے بہت سے معزز شخصوں کی جانب سے گورنمنٹ کی خدمت میں پیش ہونے والی ہے ان کی نسبت اعتراض کرنے کے واسطے ایک کمیٹی قائم کی جائے۔ .....مولوی سید احمد خاں بہادر سی۔ ایس۔ آئی، اس کے سکریٹری مقرر کئے جاویں..... (۱۲/دسمبر)

اداریہ: ''ہندستانیوں کی بدقسمتی'': **سول سروس میں ہندستانیوں کو لیے جانے کے خلاف انگریزی اخبار نے نوٹ لکھا ہے، اس پر سخت تنقید** (۱۲/دسمبر)

''ہندستانیوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق ایک عمدہ کوشش'' پایونیر نے میسور کالج کے طلباء کی بعض کوششوں کو سراہا ہے، پایونیر سے منقول (۱۲/دسمبر)

''روئداد سب کمیٹی مرزاپور **بتائید مدرسۃ المسلمین**'' از محمد اکرام حسین۔ (۱۲/دسمبر)

''میور کالج الہ آباد کی بنیاد کا پتھر رکھے جانے کی تقریب'': ایڈریس وغیرہ (۱۹/دسمبر)

''**جلسۂ علی گڈھ بسلسلۂ مدرسۃ العلوم**'' (۲۶/دسمبر)

''تقریر صدر انجمن مسلمانان پنجاب'': ماتحت مجلس خزانۃ البضاعۃ **لتاسیس مدرسۃ العلوم**

المسلمین (۲۶ر دسمبر)

''ہندستان کی موجودہ اور گزشتہ اور آئندہ کی حالت، اور آریہ لوگوں کے طور وطریق اور دستوروں کا بیان : دیانند سرستی کے لکھنؤ کے لکچر (۲۶ر دسمبر)

۱۸۷۳ء کے گزٹ سے جن ہندستانی اخباروں کو موجودگی کا پتا چلتا ہے، اخیر میں ان کے نام درج کرتا ہوں:

پایونیر، انگلش مین، انڈین آبزرور، ہندو رفارمر، ٹائمز آف انڈیا، انڈین مرر، انڈین پبلک اوپینین، انڈین ڈیلی نیوز، مدراس اتھینم، بمبئی گزٹ، فرینڈ آف انڈیا، بنارس گزٹ، بنگالی، امرت بازار پتریکا، نارتھ ویسٹ ہیرالڈ، لکھنؤ ٹائمز، اردو گائیڈ، پنجابی اخبار، کوہ نور، اخبار نور الانوار، اودھ اخبار، اخبار انجمن پنجاب، لوح محفوظ، اور اخبار عالم۔

☆

پس گفتار

سید کے گزٹ پر طویل گفتگو ہوئی،

الہ آباد کے اکبر کہہ رہے تھے:

ع شعر میں کہتا ہوں، سمجھے تم کرو!

یعنی گزٹ میں جو کچھ سید لکھتے تھے، پڑھیے تو اتنی گفتگو سے بھی آپ تھوڑا بہت لطف تو اٹھا ہی لیں گے، جو گزٹ کے اس سرسری مطالعہ سے مل سکتا ہے لیکن اصل توجہ اس طرف دلانی ہے کہ جو مندرجات آپ نے ملاحظہ کیے ان میں **عورتوں کی تعلیم** کی طرف توجہ دہانی پر سرسید کی سپورٹ (اس عام خیال کے برخلاف کہ سرسید عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے)، انگریز بہادر (مسٹر کیمپسن) کی، **ذریعہ تعلیم** کے سلسلہ میں، تجویز کی پرزور مخالفت، **اردو ہندی** مسئلہ پر قوم کو تقسیم کرنے کی سازش وغیرہ، جو بحثیں چھڑیں اور جن عنوانات پر سرسید نے جیسا اسٹینڈ لیا: ایک بار مندرجہ بالا اقتباسات/ مندرجات/ تبصرہ جات کو پھر پڑھیے، تاکہ **نتائج** نکال سکیں۔ سید کو جتنا پڑھتے جائیں گے وہ عظیم تر ہوتے جائیں گے۔ ان کے خطبات پڑھیے، گزٹ (اور تہذیب الاخلاق) میں ان کی تحریریں پڑھیے، خطوط پڑھیے: اور سید عظیم پھر عظیم تر پھر عظیم ترین، سربلند ترین ہوتے، اور اوپر اٹھتے ہی چلے جائیں گے۔

ایک معاملہ میں البتہ کچھ ہمیں بہت ادب کے ساتھ اختلاف کرنے کی جسارت کرنی ہے: اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط بھی متوازی طور سے چلانے کی انگریز بہادر کی سازش ہی مان کر چلیں (اور سازش بھی کیسی جو دو قومی نظریہ کو پوری طرح راسخ کر دینے والا اقدام بنتا گیا)، تو بھی اگر دو زبانوں اور دو رسوم خط پر اصرار کے بجائے ایک زبان اور دو خطوں کی بات بھی تو چل سکتی تھی، اس کی طرف خیال کیوں نہیں گیا۔ بیس تیس سال بعد گاندھی جی نے **ہندستانی** زبان کی جو تحریک چلائی (جو اردو اور ہندی دونوں کو ساتھ لے کر چلتی، تو کیا دو انتہا پسندیوں کا یہ درمیانی راستہ اوس وقت بھی **مناسب تر** نہیں تھا؟ اور آپ نے ہم نے دیکھا، اور دیکھ رہے ہیں، کہ آج میڈیا کے اس طوفان میں جہاں درجنوں چینل (channel) اپنی اپنی بولیاں بولتے رہتے ہیں، ان چینلوں میں آپ نے نوے فیصدی اردو

بولتے دیکھی ہے یا ہندی؟ اور **بولی** کی حد تک تو رسم الخط کا مسئلہ آتا ہی نہیں! تو یہ جو چینلوں میں اردو کا چلن اتنا بڑھ گیا (اور نوے فیصد ہم نے زبان قلم روک کے کہا، سچ تو یہ ہے نوبت ایک کم سو فیصد تک پہنچ گئی ہے) اردو کے محاورے اور شعر بڑے مزے سے پارلیمنٹ میں، اسمبلیوں میں، الیکشن کی تقریروں میں اور عام جلسے جلوسوں میں آپ سنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ اردو والے جیت گئے! اور سب سے بڑھ کے مشاعرے! مشاعروں کو آپ کیا کہیں گے! مشاعرے کا اعلان ہوا اور مجمع : ٹھٹھ کے ٹھٹھ! اور لوگ اردو کی واہ واہ کرتے ہوئے، اپنے گھروں تک اردو شعر گنگناتے ہوئے، اور لطفِ مکرر لیتے ہوئے، اور گھر جا کر اپنی نوٹ بک میں ھندی رسمِ خط میں اپنی پسند کے اشعار کو لکھتے ہوئے، دوسروں کو فخریہ سناتے ہوئے، (جیسے تشریف رکھیے - بلکہ - تشریف رکھتا ہوں کہنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہوئے) کہتے یہی رہیں گے کہ ہم ہندی بولتے ہیں۔ کسی اور موقع سے اقبال نے کہا تھا :

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

تو مشاعرے کو ہندی کہو، فلم کو ہندی کہو

ع ہم کوئی اچھا سا رکھ لیں اپنے ویرانے کا نام!

(ش)

علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا جدید ترین بھرپور مطالعہ

ڈاکٹر طاہر مسعود کی تصنیف ''اردو صحافت انیسویں صدی میں'' سے مقتبس

ڈاکٹر طاہر مسعود کی ایک انسائیکلو پیڈیائی کتاب ''**اردو صحافت ۱۹ویں صدی میں**'' سرسید کے گزٹ کے سلسلہ میں تازہ ترین مطالعہ کہنا چاہیے۔ ویسے تو یہ مطالعہ بھی سترہ اٹھارہ سال پرانا ہوا، لیکن اس کے بعد گزٹ پر کوئی تفصیلی مطالعہ سامنے نہیں آیا اس لیے فی الحال ہم اسے ہی تازہ ترین مانیں گے۔

یہ کتاب اردو صحافت کے متعلق صرف ایک کتاب نہیں بلکہ بارہ پندرہ کتابوں کا مجموعہ کہنا چاہیے جسے بلاشبہ اردو صحافت کا دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) کہا جاسکتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جو کام ایک پوری اکیڈمی کے کرنے کا تھا، **طاہر مسعود** نے تن تنہا سرانجام دے لیا۔ ''حقیقتہً یہ ایک ایسی انسائیکلو پیڈیا ہے جسے ہمیشہ اس موضوع پر استناد کا درجہ حاصل رہے گا''۔ یہ ڈاکٹر خالد حسن قادری کی رائے ہے اور ہمیں اس کے ہر لفظ سے پورا اتفاق ہے۔

ضخامت کے پیش نظر صرف انیسویں صدی کے اخبارات اس کتاب کا موضوع ہیں۔ (رسائل، مرتّب کے منصوبہ کے مطابق اگلی جلد میں آئیں گے)۔ سرسید کا گزٹ لازماً انیسویں صدی کے اہم اخبارات میں یا مولانا آزاد کے 'مستعملہ' جرنل کی حیثیت سے انیسویں صدی کے ممتاز ترین صحافتی کارناموں میں شمار ہوتا تھا/ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طاہر مسعود نے بجا طور سے اس کا تفصیلی مطالعہ کر کے اس کے بارے میں ایک محیط کل تحریر قلمبند کر دی ہے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ گزٹ کے قدیم ترین جائزہ کے ساتھ یہ جدید ترین جائزہ بھی موجودہ پیشکش میں شامل کر دیں۔ (ش)

اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

سرسید نے اپنی زندگی میں ایک اخبار (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) اور ایک رسالہ (تہذیب الاخلاق) جاری کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اخبار کو تو قوم نے ہاتھوں ہاتھ لیا لیکن رسالے کی شدید مخالفت ہوئی۔ اخبار کی وجہ سے سرسید رہنما اور مصلح قوم قرار پائے لیکن رسالے کی وجہ سے کافر، ملحد، نیچری اور کرسٹان کہلائے۔ اخبار تو معاصر اخبارات کے لیے نمونۂ تقلید ہوا اور رسالے کے مندرجات کے خلاف نہ صرف مضامین کا انبار لگ گیا بلکہ ایک اخبار (نور الآفاق) بھی نکل آیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان بدترین مخالفتوں کے باوجود "تہذیب الاخلاق" کو سرسید کا مہتم بالشان صحافتی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تو یہ رائے ہے کہ عوام کے ذہنی رجحانات پر جتنے ہمہ گیر اثرات "تہذیب الاخلاق" نے چھوڑے برصغیر کے کسی اور رسالے نے نہیں چھوڑے (☆)۔ حالاں کہ دیکھا جائے تو گزٹ کو کئی اعتبار سے "تہذیب الاخلاق" پر سبقت حاصل ہے۔ مثلاً:

ا۔ گزٹ کا خیال طبع زاد تھا جب کہ "تہذیب الاخلاق" سرسید کے سفر لندن کی دین تھا اور ایڈیسن اور اسٹیل کے معروف رسائل "ٹیٹلر" اور "اسپیکٹیٹر" سے متاثر ہو کر نکالا گیا تھا ☆☆

☆ ابوسلمان شاہ جہاں پوری: سرسید احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں۔ برگِ گل سرسید نمبر، اردو آرٹس کالج کراچی، ۶۹-۱۹۶۸ء، ص ۵۱

☆☆ عتیق صدیقی نے بجا طور پر یہ سوال اٹھایا ہے کہ سرسید کے کسی سوانح نگار نے غور نہیں کیا کہ سرسید جب انگلستان پہنچے تو اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کو بند ہوئے ڈیڑھ صدی ہو چکی تھی تو پھر ان رسائل تک سرسید کی رسائی کیوں کر ہوئی۔ ان کا اپنا خیال یہ ہے کہ لارڈ اسٹیفن لی اور لارڈ لارنس نے اس باب میں سرسید کی مدد کی ہوگی (سرسید احمد خان ایک سیاسی مطالعہ، ص ۱۳۵)

۲۔گزٹ ''تہذیب الاخلاق'' کے اجرا سے چار سال قبل منظر عام پر آ چکا تھا اور اس عرصے میں اس کا شمار ملک کے ممتاز اور معتبر اخبارات میں ہونے لگا تھا۔

۳۔گزٹ کی خبروں ، اداریوں اور مضامین میں تنوع اور وسعت تھی۔ ذولسانی اخبار ہونے کی وجہ سے اس کے قارئین کا دائرہ بڑا تھا۔''تہذیب الاخلاق'' کی بحث مسلمانوں کی مذہبی اور تہذیبی اصلاح تک محدود تھی۔

۴۔گزٹ نے اردو صحافت کو متاثر کیا۔ اینگلو ایڈین انگریزی اخبارات جو اردو اخبارات کے معیار کا مذاق اڑاتے تھے، انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے متعلق ان کی رائے ہمیشہ عمدہ رہی اور ان اخباروں (مثلاً پائنیر الہ آباد) میں گزٹ کا حوالہ آتا رہا۔

۵۔سرسید کی تعلیمی جدوجہد کو تیز تر کرنے میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا اس کے برعکس ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین کی وجہ سے سرسید کی تعلیمی کوششوں کو نقصان پہنچا۔

۶۔''تہذیب الاخلاق'' تین بار نکل کر بند ہوا جب کہ گزٹ پابندی کے ساتھ ۳۲ سال تک شائع ہوتا رہا۔ آخر کار تھک ہار کر سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی گزٹ ہی میں ضم کر دیا۔

۷۔گزٹ نے مسلمانوں کے سیاسی اور تعلیمی مسائل کو اپنا محور بنایا اور اس کے واضح نتائج حاصل کیے۔''تہذیب الاخلاق'' نے زیادہ تر تہذیبی و تمدنی معاملات کی اصلاح و درستگی پر توجہ مبذول کی۔ چوں کہ ان تہذیبی مباحث کے ڈانڈے بالآخر مذہب سے جا کر مل جاتے تھے اور سرسید کی مخالفت ہی ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر ہوئی اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ سرسید نے جو قوم کو مہذب بنانے کے لیے ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا تھا اس کے اثرات کا رخ مثبت تھا یا منفی یا ملی جلی صورت تھی۔

''تہذیب الاخلاق'' کو جو اتنی اہمیت دی گئی اس کی بڑی وجہ اس کے موضوعات اور اسلوب نگارش ہے۔ گزٹ، اخبار تھا اور اس میں مسائل حاضرہ پر مضامین اور اداریے ہوتے تھے جن کی اہمیت وقت گزرنے پر ویسی نہ رہی لیکن ''تہذیب الاخلاق'' میں مستقل اور دائمی

اہمیت کے موضوعات و مسائل پر قلم اٹھایا گیا تھا اور طرزِ تحریر وہ اختیار کیا گیا جو مروّجہ اسلوب سے ہٹ کر تھا اور بہ قول ڈاکٹر سید عبداللہ جس میں تکلف اور آرائش کا شائبہ تک نہ تھا نیز ان مضامین میں ادب کو عقلی، اجتماعی، تہذیبی اور تمدنی روابط سے پیوست کر کے نئی جدت پیدا کی گئی تھی جس کی مثال اس سے پہلے اردو ادب میں نہیں تھی (☆)۔ یہی سبب ہوا کہ اردو زبان کے ادیبوں اور دانش وروں نے ''تہذیب الاخلاق'' کو تو اچک لیا اور ''گزٹ'' پس منظر میں چلا گیا۔ گزٹ کی ایک بدنصیبی یہ بھی ہے کہ اس کی فائلیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی لائبریری کے سوا مشکل ہی سے کہیں ملتی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ ایک نظر میں(۱)

سائز، صفحات، دورانیہ

اخبار سائنٹفک سوسائٹی یا علی گڑھ انسٹی گزٹ ٹیوٹ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ سے جاری ہوا۔ یہ ۱۶ × ۱۱/۱۴ سائز کے دو کالموں پر شائع ہوا تھا۔ ایک کالم میں اردو ایک میں انگریزی مواد ہوتا تھا۔ ۱۸۹۶ء میں اخبار کے سائز میں تبدیلی آ گئی اور یہ ۸ × ۱۶/۲۵ کے سائز پر نکلنے لگا اور اس کے ہر صفحے پر دو کے بجائے چار کالم دیے جانے لگے۔ اس تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ ''تہذیب الاخلاق'' اس میں ضم ہو گیا تھا۔ گزٹ ہفت روزہ تھا اور سولہ صفحات پر مشتمل تھا لیکن جون ۱۸۷۷ء سے سہ روزہ ہوا تو یہ ہفتے میں ایک دن سولہ صفحات پر نکلتا تھا اور ایک دن بارہ صفحوں پر۔ سولہ صفحوں والے اخبار میں بارہ صفحات پر خبریں اور مضامین اور چار صفحات پر اشتہارات ہوتے تھے۔ بارہ صفحے کے اخبار میں دو صفحے اشتہارات کے لیے مخصوص تھے۔ اشتہارات نہ ملنے کی صورت میں ان صفحوں پر بھی خبریں اور مضامین شائع کر دیے جاتے تھے۔ اشتہار زیادہ ہونے پر صفحے بڑھ جاتے تھے۔ ۱۸۹۶ء میں اخبار پھر ہفتہ وار ہو گیا تو صفحات کی تعداد بھی بارہ کر دی گئی۔

☆سید عبداللہ: تہذیب الاخلاق کی اہمیت: حوالۂ ثانی ابوسلمان شاہجہانپوری، ایضاً، ص، ۸۷۔

مطبع اور ملکیت

اخبار سرسید کے اپنے پریس میں چھپتا تھا اس کا نام ''سید احمد پریویٹ پریس'' تھا۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس ہوگیا تو انھوں نے اپنا پریس جس کی مالیت آٹھ ہزار روپے تھی، سائنٹفک سوسائٹی کو دے دیا جس کے بعد اس کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ پریس ہوگیا۔ گزٹ آخر وقت تک اسی پریس میں چھپتا رہا۔ گزٹ، سائنٹفک سوسائٹی کی ملکیت تھا اور اسی کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا لیکن سوسائٹی جب زوال پذیر ہوئی اور اس کے اراکین کی تعداد ۱۰۱ سے گھٹ کر صرف چار رہ گئی تو ۱۰ جولائی ۱۸۸۷ء کو سرسید نے اسے مدرسۃ العلوم کی مجلس منتظمہ کے حوالے کر دیا۔ مجلس کے تحت یہ اخبار مارچ ۱۸۹۸ء تک شائع ہوتا رہا۔

سالانہ چندہ

گزٹ کی قیمت سالانہ بارہ روپے اور مع محصول پندرہ روپے تھی۔ ۱۸۶۹ء میں محصول ڈاک میں اضافے کی وجہ سے قیمت مع محصول اٹھارہ روپے ہوگئی۔ ۱۸۹۶ء میں چندہ کم کر کے مع محصول بارہ روپے سالانہ کر دیا گیا۔

انضمام

اس اخبار کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک اخبار اور ایک رسالہ ضم ہوا اور آخر میں یہ خود علی گڑھ کالج میگزین کا تتمہ بن گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ستمبر ۱۸۷۶ء میں راجا جگت سنگھ رئیس تاج پور نے اپنا مطبع جس میں انگریزی اخبار ''پروگریس'' چھپتا تھا، سائنٹفک سوسائٹی کو عطیہ کر دیا۔ چناں چہ ۸ ستمبر سے اخبار کے نام میں یہ تبدیلی آ گئی: ''اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ جس میں پروگریس مل گیا ہے'' انگریزی میں تبدیلی کی صورت یہ تھی:

The Aligarh Institute Gazete with which is incorporated the Progress.

۱۸۹۶ء میں ''تہذیب الاخلاق'' کو بھی اخبار میں شامل کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ رسالے کی

اشاعت اتنی گھٹ گئی تھی کہ اس کے اخراجات (اور اخراجات بھی سو روپے) کا برداشت کرنا سرسید کے لیے دشوار ہوگیا تھا۔ کچھ خریداروں نے چندے بھیج دیے تھے اس لیے فوری طور پر اس کا بند کرنا (اور وہ بھی تیسری مرتبہ) مناسب نہ تھا اس لیے اسے گزٹ میں ضم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اب اخبار کا نام یہ ہوگیا:

"The Aligarh Institute Gazette of the Mohammaden Anglo Oriental Coliege with which are incorporated the Mohammaden Social reformer."

سرسیّد کے انتقال کے بعد گزٹ اپریل ۱۸۹۸ء سے کالج میگزین میں شامل کردیا گیا۔ ایک سال تک یہ "ایم اے او کالج میگزین اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ مع پروگریس" کے نام سے نکلتا رہا۔ ۱۸۹۹ء کے بعد اس کی انفرادی حیثیت بحال ہوگئی اور یہ بیسویں صدی کے اوائل تک اپنے پرانے نام ہی سے شائع ہوتا رہا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں دوسرے اخبارات کے ضم کرنے اور لوح کے نیچے اس کے اعلان کا طریقہ بھی سرسید نے انگریزی اخبارات سے اخذ کیا تھا۔ مثلاً "دی ٹائمز آف انڈیا" کے ۱۸۶۱ء کے شماروں پر بھی ہمیں ایسی ہی عبارت ملتی ہے:

The Times of India in which the Bombay Times and Bombay Saturday are incorporated.

مولوی محمد اسماعیل کی ادارت

گزٹ جاری ہوا تو اس کے مدیر سرسید احمد خان تھے۔ اگست ۱۸۶۷ء میں ان کا تبادلہ بنارس ہوگیا۔ جاتے ہوئے انھوں نے مولوی محمد اسماعیل کو اخبار کی ادارت سونپ دی۔ دس سال تک مولوی صاحب نے نہایت حسن وخوبی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ سرسید کی قدر آور شخصیت کی وجہ سے گزٹ کی کامیابی میں مولوی صاحب کا تذکرہ برائے نام ہوتا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ گزٹ میں جو توازن و اعتدال تھا اس میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ ۱۸۷۷ء میں سرسید ملازمت سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ آگئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔

مولوی محمد اسماعیل کا سرسید سے فکر و نظر کا اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ چناں چہ انھوں نے سرسید کے علی گڑھ پہنچتے ہی اخبار کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا جس کے بعد سرسید نے ادارتی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ گزٹ پر کبھی مدیر کا نام شائع نہیں ہوتا تھا۔ پہلی بار ۳ جنوری ۱۸۹۷ء سے سرورق پر سرسید کا نام بہ طور مدیر نمودار ہوا۔ سرسید جب تک زندہ رہے، ادارت ان ہی کے ہاتھ میں رہی۔

گزٹ کے مہتممان

گزٹ پر مہتمم کا نام پابندی سے چھپتا تھا۔ مہتمم بدلتے بھی رہے۔ گزٹ صدی کے اختتام تک منشی محمد یار خاں (۱۸۶۶ء۔۱۸۶۷ء)، حافظ عبدالرزاق (۱۸۶۷ء۔۱۸۷۸ء)، حافظ عبدالرحمٰن (۱۸۷۸ء۔۱۸۷۸ء)، شیخ علیم اللہ (۱۸۷۸ء۔۱۸۷۹ء)، گلاب رائے (۱۸۷۹ء۔۱۸۸۸ء)، شیخ علیم اللہ (۱۸۸۹ء۔۱۸۹۳ء) اور محمد ممتاز الدین (۱۸۹۳ء۔۱۹۱۳ء) کے زیر اہتمام شائع ہوتا رہا۔

گزٹ کا موٹو

گزٹ ایک سیاسی اخبار تھا چناں چہ اس نے پریس کی آزادی کو اپنا موٹو بنایا تھا۔ ذیل کی عبارت اخبار کے سرورق پر دونوں زبانوں میں نمایاں طریقے سے شائع کی جاتی تھی:

"Liberty of the press is a prominent duty of the government and natural right of the subject"

"آزادی چھاپے کی ہے۔ ایک بڑا فرض گورنمنٹ اور اصلی، جبلی حق رعیت کا"

نو مہینے بعد ۴ جنوری ۱۸۶۷ء کو موٹو کی عبارت تبدیل ہوگئی۔ نئی عبارت یہ تھی۔

"To permit the liberty of the press is the part of the wise government to preserve it is the part of a free people.

"چھوڑ رکھنا چھاپے کی آزادی کا، کام ایک دانا گورنمنٹ کا۔ اور برقرار رکھنا اس آزادی کا، کام ہے ایک آزاد رعیت کا"۔

پریس کی آزادی کا یہ موٹو یکم جون ۱۸۷۷ء کو حذف کر دیا گیا لیکن اس کی کوئی وجہ نہیں

بتائی گئی۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وائسرائے لارڈ لٹن نے ورنیکیولر پریس ایکٹ کے نفاذ کی تیاری شروع کر رکھی تھی۔ دیسی اخبارات کی آزادی چھن جانے کی صورت میں اس سلسلہ کی اشاعت بے معنی تھی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ گزٹ پریس کی آزادی کا زبردست علم بردار تھا اور اپنے صفحات پر ہر قسم کی پابندی کی اعلانیہ مخالفت کرتا رہا تھا۔

طباعت

گزٹ کی ایک اور نمایاں خصوصیت ٹائپ کی طباعت تھی۔ اس زمانے میں شمالی ہند میں لیتھو کی چھپائی مقبول تھی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل جتنے اخبارات نکلے تھے ان میں اکثر و بیش تر اخبار لیتھو پر چھپتے تھے۔ سرسید نے اس معاملے میں بھی دور بینی سے کام لیتے ہوئے ٹائپ کو ترجیح دی۔ ان کی سوچی سمجھی رائے تھی کہ اردو زبان اور اردو صحافت دونوں کی ترقی کے لیے ٹائپ کو اختیار کرنا ضروری ہے چناں چہ انھوں نے گزٹ اور ''تہذیب الاخلاق'' دونوں کو ٹائپ پر شائع کیا۔ انھیں یہ بھی احساس تھا کہ قارئین کتابت کو زیادہ پسند کرتے ہیں لہٰذا انھوں نے ٹائپ میں بھی موٹے اور روشن حروف والے ٹائپ کو استعمال کیا تاکہ وہ قارئین کی آنکھوں کو دیکھنے میں بھلے محسوس ہوں اور یوں کتابت کی کمی کی تلافی بھی ہو جائے۔ اخبار کے لے آؤٹ میں بھی سرسید نے مروجہ انداز سے انحراف کیا۔ اس زمانے کے اکثر اخبارات سرورق کو گل بوٹوں سے مزین کیا کرتے تھے۔ سرسید نے ۱۸۷۷ء میں اخبار کی ادارت سنبھالی تو پہلا کام تو یہ کیا کہ اخبار کے دو نام کے قصے کو تمام کیا۔ اخبار کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ قرار پایا۔ اور پھر اخبار کے سرورق اور لوح میں بھی سادگی اور نفاست کا اہتمام کیا۔ چناں چہ گزٹ کی ظاہری شکل و صورت سے بھی سنجیدگی اور وقار جھلکتا تھا۔ اخبارات کے نام عموماً انگریزی اور اردو دونوں میں لکھے جاتے تھے۔ سرسید نے اس طریقے کو بھی بدل دیا اور اعلان کیا کہ اب صرف انگریزی حرفوں میں گزٹ کا نام لکھا جائے گا۔

گزٹ کے ضمیمے

گزٹ اہم خبروں پر مشتمل ضمیمہ بھی شائع کرتا تھا۔ اصغر عباس نے اپنی کتاب ''سرسید کی

صحافت'' میں لکھا ہے: ''اکثر تار برقی کی خبریں روزانہ چھاپی جاتی تھیں اور وہ خریداروں کو کہ بطور اکسٹرا پرچے کے بھیجی جاتی تھیں۔ جنگ روم و روس کے زمانے میں کسی اہم واقعے کے سلسلے میں گزٹ کا ضمیمہ بھی شائع ہوتا تھا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں جب کہ اخبار کی خریداری فارغ البال طبقے تک محدود تھی۔ گزٹ نے ایک اچھا خاصا حلقہ ایسا پیدا کر دیا تھا جو اخباری ذوق رکھتا تھا اور لوگ تازہ خبروں کے لیے بے چین رہتے تھے'' (ص ۸۴)۔ اکسٹرا چھاپنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ علی گڑھ میں تار برقی کی تازہ خبریں اخبار چھپنے کے بعد پہنچتی تھیں اس لیے ان خبروں کو علاحدہ سے شائع کر کے اسے اخبار میں رکھ دیا جاتا تھا۔ بعد میں جب تار برقی کی خبریں علی گڑھ میں گیارہ بجے دن میں پہنچنے لگیں تو تازہ خبریں اخبار ہی میں شائع کر دی جاتی تھیں۔ خبروں کو بروقت پہنچانے کی ضرورت اس وقت کے حالات کا تقاضا تھی۔ ترکی اور روس کی جنگ میں مسلمانان ہند کی دلچسپی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ باگ تازہ ترین جنگی صورت حال سے باخبر ہونا چاہتے تھے۔ چناں چہ یہی وہ زمانہ ہے جب ''اودھ اخبار'' روزانہ ہوا۔ ''کوہ نور'' ہفتے میں دو بار شائع ہونے لگا۔ خود گزٹ بھی ان ہی دنوں سہ روزہ ہوا۔

مشتملات

''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' میں ہر طرح کی قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور سماجی خبریں شائع ہوتی تھیں لیکن چوں کہ سرسید کی اصل دلچسپی تعلیم سے تھی اس لیے اخبار میں تعلیمی خبریں نمایاں اہمیت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ستمبر ۱۸۸۵ء سے اخبار میں سررشتہ تعلیم کی خبروں کے ایک مستقل کالم کا اضافہ کیا گیا جس میں محکمے کی نئی تقرریاں، تبادلے، احکامات، تجاویز، سرکاری مراسلات اور درسی کتب پر تبصروں کو جگہ دی جاتی تھی۔ اخبار کے کل مواد میں تیس فی صد حصہ خبروں اور پندرہ فی صد اداریوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ باقی پچپن فی صد مواد میں صحافتی، تعلیمی، سماجی اور سیاسی نوعیت کے مضامین نیز انجمنوں اور تعلیمی اداروں کی رودادیں شائع کی جاتی تھیں۔ خبروں میں ایک تہائی غیر ملکی خبریں اور دو تہائی ملکی خبریں ہوتی تھیں۔ یہ خبریں معتبر ملکی اور غیر ملکی اخباروں سے اخذ کی جاتی تھیں۔ اخبار میں سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں کو خصوصیت سے اہمیت دی جاتی تھی بلکہ اخبار کے اوّلین شمارے میں کل بیس صفحات میں تین صفحے

سوسائٹی کی خبروں اور رودادوں سے بھرے ہوئے تھے۔

اشاعت

گزٹ کی سرکولیشن میں سال بہ سال اضافہ ہوا تاہم اس زمانے کے کئی اخباروں سے اس کی اشاعت بہت کم تھی۔ نور الابصار، اودھ اخبار، اخبار عالم، نجم الاخبار اور کوہ نور وغیرہ کی سرکولیشن بہرحال گزٹ سے زیادہ تھی۔ ۱۸۶۶ء میں اخبار کے خریداروں کی تعداد صرف ۵۲ تھی۔ ۱۸۶۹ء میں اشاعت بڑھ کر ۲۹۳ ہوگئی۔ ۱۸۷۱ء میں اشاعت تقریباً دوگنی ہوگئی۔ اس سال اشاعت ۴۶۲ رہی۔ لیکن اگلے سال حکومت نے اخبار کی خریداری بند کردی جس کی وجہ سے اشاعت گھٹ گئی اور ۳۸۱ پرچے شائع ہوئے۔ تاہم ان برسوں میں اخبار کی سرکولیشن دوسرے تمام اخبارات سے زیادہ رہی (۲)۔ ۱۸۷۷ء میں اشاعت میں مزید کمی واقع ہوئی۔ اس سال اشاعت ۳۴۱ تھی۔ کالج کے قیام اور سیاسی مصروفیات میں الجھ جانے کی وجہ سے سرسید کی توجہ گزٹ پر سے کم ہوگئی تھی۔ چناں چہ اشاعت میں اضافہ نہ ہوسکا۔

اشتہارات

گزٹ کی آمدنی کا ایک ذریعہ اشتہارات بھی تھے۔ سات سطر کے اشتہار کی اجرت ایک روپیہ تھی۔ ابتدا میں زیادہ تر اشتہارات سائنٹفک سوسائٹی کی مطبوعات کے بارے میں ہوتے تھے، جن سے آمدنی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ پھر تعلیمی نوعیت کے اشتہارات چھپنے لگے۔ ۱۸۹۷ء میں تعلیمی اشتہارات کا معاوضہ ۸ آنے تھا خواہ وہ کتنی ہی سطروں پر مشتمل ہو۔ عام اشتہارات کے لیے ۲ آنے فی سطر مقرر ہوا تھا۔ اشتہارات کی اشاعت کے لیے بھی سرسید نے ایک اخلاقی ضابطہ وضع کیا تھا جس کے تحت تجارتی اشتہارات کی اشاعت پر انھوں نے پابندی عائد کر رکھی تھی۔ سرسید تجارتی اشتہارات کی اشاعت کو خلاف قانون تصور کرتے تھے۔

قلمی معاونین

اس صدی کے اکثر اخبارات میں مضمون نگاروں کے نام درج کرنے کا رواج نہیں تھا۔

گزٹ نے مضامین پر ان کے لکھنے والے کے نام کی اشاعت کو لازم قرار دیا۔ چناں چہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے قابل ذکر قلمی معاونین میں مولوی ذکاء اللہ، شبلی نعمانی، حاجی محمد اسماعیل خاں، قاضی سراج الدین احمد، مولوی سمیع اللہ خاں، مولوی وحید الدین سلیم، خواجہ غلام الثقلین، بابو ہریش چندر اور مولوی کرامت حسین شامل تھے۔ ان میں سے اکثر شخصیات کا جو علمی اور ادبی مرتبہ تھا اس سے گزٹ کے مضامین کے معیار کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

گزٹ کی خصوصیات اور اثرات

''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کا اجرا اردو صحافت کے لیے فال نیک ثابت ہوا۔ اس نے اخبار کی تمام اصناف میں قابل لحاظ جدتیں اور تبدیلیاں پیدا کیں۔ خبر نویسی کی تکنیک، مضامین اور اداریوں کی زبان، موضوعات کا انتخاب، معروضیت کا اہتمام، احساس ذمہ داری، تنوع، خبروں کی ترسیل میں عجلت اور تیزی، آزادی رائے، اختلاف کا شائستہ طریقہ، مغربی علوم کی اشاعت، سیاسی تربیت غرضے کہ ان تمام پہلوؤں سے دیکھا جائے تو گزٹ ایک ایسا اخبار تھا جس نے اپنا اعتبار قائم کیا اور معاصر اردو اخبارات کے لیے نمونۂ تقلید بھی ہوا۔ یہ ساری خوبیاں گزٹ میں اس لیے تھیں کہ اس کا ایڈیٹر اپنے ذہن میں صحافت کے مقاصد کا واضح شعور رکھتا تھا۔ اس زمانے میں ملک کے گوشے گوشے سے اردو اخبارات خود رو پودوں کی طرح اگ رہے تھے لیکن ایسے اخبارات جن کے ایڈیٹر فن اخبار نویسی کے تقاضوں اور اس کی نزاکتوں سے بھی واقف ہوں، معدودے چند تھے۔ گزٹ ان اخبارات کے لیے استاد اور ناصح مشفق تھا۔ اس کے اخبار نے اردو صحافت کو جو کچھ دیا اور جو کچھ سکھایا تا حال اس کا اندازہ کیا گیا ہے اور نہ صحیح معنوں میں اعتراف۔ الطاف حسین حالی نے صحیح لکھا ہے کہ جو اخبارات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نکلنے سے پہلے ملک میں جاری ہوئے، ان کا مقابلہ ان اخباروں کے ساتھ کیا جائے جو اس کے بعد جاری ہوئے تو اس مقابلے سے صاف معلوم ہوجائے گا کہ اردو اخبارات نے اس اخبار سے کیا سبق حاصل کیا ہے۔

ذیل میں چند مثالیں حالی مرحوم کے بیان کی تائید میں پیش کی جاتی ہیں:

گزٹ نکلا تو اکثر اردو اخبارات کی خبروں میں اختصار اور جامعیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خبریں

ادارت (ایڈیٹنگ) کے بغیر ہی شائع کردی جاتی تھیں جس کی وجہ سے خبروں میں غیر ضروری تفصیلات کی بھرمار ہوتی تھی۔ ایڈیٹروں میں "خبر شناسی" (news sense) کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس خبر کو جہاں چاہتے شائع کردیتے تھے۔ خبروں کو ان کی اہمیت کے لحاظ سے جگہ نہیں دی جاتی تھی۔ اخبار کا پہلا صفحہ تو قواعد وضوابط اور اخبار کے چندے کی تفصیل ہی میں طائع ہوجاتا تھا۔ گزٹ نے ۱۸۶۹ء سے ایک اہم تبدیلی کی کہ "تاربرقی کی خبریں" کے عنوان سے پہلے صفحے پر ایک کالم مخصوص کردیا۔ اس میں ہفتے بھر کی ملک اور بیرون ملک کی خبریں درج ہوتی تھیں۔ یہ خبریں نہایت مختصر، ایک سطری یا دو سطری ہوتی تھیں۔ مثلاً "برلن ۳ جون: کل کانگریس یونان کے معاملے کی نسبت بحث کرنے میں مصروف رہی"۔ "لندن یکم جولائی: ڈیوک آف کیمبرج مالٹا سے یہاں پہنچ گئے ہیں" وغیرہ۔ گزٹ کا یہ انداز مقبول ہوا اور اسے پنجاب کے اخبارات میں سب سے پہلے "اخبار عام" نے اپنایا پھر "پیسہ اخبار" نے اس میں کچھ جدتیں پیدا کیں۔ شمالی ہند میں اٹاوہ کے "نجم الاخبار" اور البشیر" کلکتہ کے "اردو گائیڈ" اور متعدد اخبارات نے اسی انداز کو اختیار کرلیا۔ ان خبروں میں اہم بات یہ ہے کہ سطر تاریخ بھی درج ہوتی تھی جس کی روایت ابھی اردو صحافت میں نہیں پڑی تھی۔ اسی طرح "مختلف واقعات" کے عنوان سے مختصر خبروں کا کالم بھی مقبول ہوکر اردو اخبارات میں مروج ہوا۔

۲۔ گزٹ میں معاصر اخبارات بالخصوص نئے نکلنے والے اخبارات پر تبصرے بھی کیے جاتے تھے۔ ان تبصروں میں بے لاگ رائے دی جاتی تھی۔ گزٹ نے ایسا ہی ایک تبصرہ بنگلور کے "میسور اخبار" پر کیا۔ اس اخبار کو نکلے ہوئے مشکل سے پانچ مہینے ہوئے تھے اور اب تک یہ کوئی معیار پیش نہیں کرسکا تھا۔ گزٹ میں تبصرہ شائع ہوا تو "میسور اخبار" میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا حال خود اخبار کی زبانی سنیے:

> ابتدائے اپریل ۱۸۷۳ء سے ہم نے اس اخبار کو جاری کیا اور عرصہ پانچ ماہ تک بہ وجوہات چند در چند اور اس وجہ سے کہ ہمارے اخبار میں آرٹیکل لکھنے کے لیے کوئی مستقل ایڈیٹر نہ ملا تھا اس اخبار میں عمدہ عمدہ آرٹیکل لکھنے سے مقصر رہے تھے الا جب کہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں منشی محمد حسین صاحب

اغلب کا رویو (ریویو) چھپا اور راقم رویو نے ہمارے اخبار کی نسبت بھی کچھ لکھا تو اگرچہ تحریر کچھ ویسی سخت نہ تھی تو بھی ہمارے دل کو رنج معلوم ہوا اور ہم نے چاہا کہ اس کا تدارک کریں۔ اس کا تدارک تو جس طرح بعض مہتممان اخبار نے کیا ویسا ہی کرنا ہم کو بھی آسان تھا لیکن چوں کہ حق بہ جانب ان کے تھا تو ہم نے بھی باوجود مصارف کثیر کے اس کا تدارک اس طرح کیا کہ ایک ایڈیٹر اور کئی معقول نامہ نگار بہم پہنچائے۔ چناں چہ اس وقت سے ہمارے اخبار میں برابر طرح طرح کے مضامین درج ہوتے ہیں۔ ہمارے مشتریان کی عنایت اور قدردانی سے جو کچھ اس اخبار کی قدر ہوئی وہ ہماری امید سے بھی بڑھ کر ہوگئی'' (۳)

۳۔ مندرجہ بالا شہادتیں تو خارجی تھیں ایک داخلی شہادت خود سرسید کا اپنا بیان ہے۔ سرسید نے ایک موقعے پر ''تہذیب الاخلاق'' اور گزٹ کی صحافتی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ ان پرچوں کی وجہ سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی آ گئی ہے۔ ''اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسندیدہ طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لغتوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روز بہ روز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتے کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ و سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو'' (۴)

انسٹی ٹیوٹ کا سیاسی کردار

انسٹی ٹیوٹ گزٹ اعلانیہ مسلمانوں کا طرف دار تھا لیکن جمہوری مزاج رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دروازے مخالفانہ خیالات کے لیے کبھی بند نہیں کیے۔ ہندی، اردو تنازعے میں اس نے اردو زبان کی پرزور وکالت کی لیکن ساتھ ہی ہندی کی حمایت میں دوسرے اخباروں میں چھپنے والے مضامین بھی چھاپے۔ سنسکرت یا ہندی کے حق میں سخت سے سخت مضمون بھی آیا تو گزٹ میں اسے جگہ ملی۔ مثلاً اردو کی مخالفت میں ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ مضمون نگار اٹاوہ کے بابو دینا ناتھ گنگولی تھے:

> جس غرض سے ہندو لوگوں نے مسلمانوں کے عہد میں ان کی زبان کو سیکھا تھا اب وہ غرض باقی نہیں رہی اور زبان اردو کے زیادہ رواج سے ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا پڑھنا بالکل موقوف ہوجاوے گا اور سنسکرت چوں کہ ہندوستان کی اصلی زبان ہے اس لیے مناسب ہے کہ اسی کو باہم مافی الضمیر کے اظہار کے واسطے ذریعہ منتخب کیا جاوے تا کہ رفتہ رفتہ سب کی ایک زبان ہوجاوے (۲۴ جنوری ۱۸۶۸ء (۵)

اس مضمون کو شائع کرنے کے بعد گزٹ نے اپنا نقطہ نظر بھی پیش کیا اور لکھا کہ سنسکرت کو رائج کرنے کا خیال محض شاعرانہ ہے کیوں کہ یہ زبان اب مردہ ہوگئی ہے اور ''پژمردہ زبان کو روزمرہ کے کاموں کے لیے شگفتہ کرنا کسی زمانے میں نہیں ہوا''۔ گزٹ نے آگے چل کر یہ لکھا کہ:

> بابو دینا ناتھ گنگولی نے جو ہمارے مذہبی جوش اور ولولے کو انگیختہ کیا ہے .....اس کی نسبت ہم افسوس سے یہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے اصولوں اور قواعد کے لحاظ سے مذہبی امور پر کچھ گفتگو نہیں کر سکتے۔

اختلافی آرا کی اشاعت کے معنی یہ ہیں کہ گزٹ کو اپنی رائے پر اعتماد تھا اور اپنے اخبار میں مخالف نقطۂ نظر کو پیش کرنے سے اسے کوئی عار اور خوف نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رائے وہی چلے گی جس میں وزن ہوگا۔ یہ جمہوریت پسندی اور کشادہ نظری جس کی روایت نہایت جرأت

ہندی سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ڈالی، اس کی مثال اس دور کی صحافت میں مشکل ہی سے ملے گی۔

انسٹی ٹیوٹ گزٹ پریس کی آزادی کا حامی تھا۔ ۱۸۷۶ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں دیسی اخبارات پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا گیا تو گزٹ نے جو سرسید کے زیر اثر حکومت کا خیر خواہ تھا، ایک طویل اداریہ شائع کیا جس کا عنوان تھا: "ہندوستانی ہونا بھی ایک جرم ہے"۔ اداریے میں اخبار نے حکومت کی ہندوستانیوں اور انگریزوں کو یکساں حقوق نہ دینے پر سخت مذمت کی اور لکھا کہ اگر یہ مطالبہ دیسی اخبارات کی جانب سے حکومت پر تنقید کرنے کی وجہ سے کیا گیا ہے تو یورپین اخبار نویس کہیں زیادہ سخت اور گستاخانہ تحریریں حکومت اور گورنر جنرل کی نسبت لکھتے ہیں لیکن انھیں یہ استحقاق محض اس بنا پر حاصل ہے کہ وہ انگریز ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ اخبار نے نہایت تلخی سے لکھا:

> اب ہماری یہ رائے ہے کہ ہندوستانی ہونا ایک بڑا جرم ہے اور گو یہ ایسا جرم ہے کہ اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں ہے مگر تاہم بڑا جرم ہے اور اگر ہم سے یہ دریافت کیا جاوے کہ یہ کیوں کر جرم ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ ہندوستانیوں کے واسطے جو مزاحمتیں پیش ہوتی ہیں وہ یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ وہ مثل اور انسانوں کے آزاد نہیں ہیں اور جو استحقاق ایک شریف قوم انسان کو بہ نظر انسانیت حاصل ہونے چاہئیں وہ ان کو حاصل نہیں ہیں اور یہ سب خرابیاں صرف ہندوستانی ہونے کی وجہ سے ہیں۔ پس بلاشبہ ہندوستانی ہونا بڑا جرم ہے۔ (۶)

سچ تو یہ ہے کہ گزٹ نے اپنے لب و لہجے کی متانت، سنجیدگی اور طریقۂ استدلال سے ایک سیاسی اخبار کا مزاج اور معیار متعین کیا۔ ایک ایسے زمانے میں جب اخبارات ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کو معیوب نہ سمجھتے تھے۔ اس نے کبھی کسی کی دل آزاری کی اور نہ کبھی سنجیدگی اور شائستگی کو ہاتھ سے جانے دیا۔ سیاسی مسائل پر نظری اور اصولی اختلاف کی بات اور ہے۔ سرسید، گزٹ کو غیر متنازعہ رکھنا چاہتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اسے مذہبی بحثوں سے حتی الامکان بچایا اور کبھی کوئی مذہبی بحث شائع بھی کی تو وہ اختلاف و افتراق کے بجائے اتحاد و بھائی چارگی

کی دعوت پر مبنی تھی۔ وجہ اس احتیاط کی یہ تھی کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سوسائٹی کا اخبار تھا جس کے ممبروں میں مسلمان، ہندو اور انگریز بھی شامل تھے۔ چناں چہ یہ احتیاط ہمیں ''تہذیب الاخلاق'' میں نظر نہیں آتی جو سرسید کا ذاتی رسالہ تھا۔ گزٹ میں ایک موقع ناراضگی اور تنازعے کا آیا تو سرسید نے فوراً قلم روک کر معاملے کو سنبھال لیا۔ ہوا یہ تھا کہ سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں سفر انگلستان پر روانہ ہوئے، وہاں پہنچ کر انھوں نے انسٹی ٹیوٹ کے لیے اپنے مشاہدات سفر ارسال کیے۔ یہ سفر نامہ گزٹ میں قسط وار چھپنے لگا۔ کسی قسط میں انھوں نے لندن کی ترقی اور انگریزوں کی شائستگی کی خوب تعریف کی اور ہندوستانیوں کی جہالت اور اجڈپن کو نشانہ بنایا۔ ایک آدھ بات سخت بھی لکھ ڈالی۔ اس پر سوسائٹی کے بعض ممبروں کو اعتراض ہوا۔ سدا سکھ لعل کے اخبار ''نور الابصار'' آگرہ نے بھی اس پر احتجاج کیا (۷)۔ سرسید کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے سفر نامے کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ بعد میں سوسائٹی کے سیکریٹری کے اصرار پر سفر نامہ بھیجنا شروع کیا لیکن پھر ایسی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔☆

☆ سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے سیکریٹری راجا جے کشن داس کے نام خط میں لکھا:

''آپ نے جو بہ سبب نہ بھیجنے حال سفر کا ناراض ہوئے ہیں، اس کی آپ سے معافی چاہتا ہوں۔۔۔۔ مگر میں نے سنا تھا کہ آپ کی سوسائٹی کے بعض ممبر میری آزادانہ تحریر کو ناپسند کرتے ہیں اور ناراض ہوتے ہیں۔ مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کیفیت اس سفر میں میرے دل پر گزرتی ہے اور جو سچائی میرے دل میں آتی ہے، اس کو آپ کی سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں گا اور جس گناہ کا الزام اپنے ہم وطن ہندوستانیوں کو دیتا ہوں، خود بھی اسی گناہ کا مرتکب ہوں، اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا موقوف کر دیا جائے'' (انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۹ نومبر ۱۸۶۹ء، بحوالہ سرسید احمد خان، ایک سیاسی مطالعہ، ص ۸۸)

مئی ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے دانش ور بنگالی صحافی سریندر ناتھ بنرجی کو حکومت نے ایک جج پر تنقید کرنے کے الزام میں دو مہینے کی سزا سنادی۔ فیصلے کے خلاف ملک کے تمام بڑے شہروں میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ بنرجی سزا کاٹ کر جیل سے نکلے تو کچھ عرصے بعد انھوں نے شمالی ہند کا دورہ شروع کیا۔ اسی سلسلے میں وہ علی گڑھ بھی گئے۔ انسٹی ٹیوٹ میں ان کے اعزاز میں جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت سرسید نے کی۔ بنرجی نے اپنی تقریر میں حکومت پر سخت حملے کیے۔ جلسے میں مسٹر تھیوڈور بیک بھی موجود تھے۔☆

☆تھیوڈور بیک لندن کے ایک خوش حال تاجر گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ کیمبرج یونی ورسٹی سے تعلیم پائی۔ سرسید کے صاحب زادے سید محمود سے ان کی دوستی تھی۔ سید محمود کی دعوت پر ۲۰ نومبر ۱۸۸۳ء کو علی گڑھ پہنچے اور یکم فروری ۱۸۸۴ء کو کالج کے پرنسپل کا عہدہ سنبھالا۔ ذہین اور غیر معمولی استعداد کے حامل تھے۔ بتدریج ان کے اختیارات میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ کالج کے سیاہ و سفید کے مالک ہو گئے۔ مسٹر بیک کالج اور طلبہ سے دلی محبت رکھتے تھے۔ اسی خلوص کی وجہ سے سرسید ان کے گرویدہ تھے۔ ان کے دور میں کالج نے نمایاں ترقی کی۔ تاہم اختیارات میں اضافے کی وجہ سے مسٹر بیک کو شک و شبے کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ سرسید کی طرح مسٹر بیک بھی مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ وہ سرسید کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ سرسید کی وفات کے بعد بجھ کر رہ گئے تھے۔ مشکل سے ڈیڑھ سال زندہ رہے۔ ۲ ستمبر ۱۸۹۹ء کو چالیس سال کی عمر میں ٹیفے میں انتقال ہوا۔ وصیت یہ تھی کہ ان کی قبر لال اینٹوں سے تعمیر کی جائے کیوں کہ یہی محسن کالج کی عمارتوں کا رنگ ہے اور قبر کی لوح پر اس شعر کا ترجمہ کندہ کرایا جائے:

کنکر چن چن محل بنایا لوگ کہیں گھر میرا
نا گھر میرا نا گھر تیرا چڑیاں رین بسیرا

سرسید کا کا نظریۂ صحافت

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سرسید کے ان ذرائع میں سے ایک ذریعہ (channel) تھا جس سے انھوں نے قومی اصلاح و ترقی کا کام لیا۔ اس اخبار نے صحافت کا اعلیٰ معیار پیش کیا۔ یہ معیار سرسید کے تصورِ صحافت کا پرتو تھا۔ پروفیسر متین الرحمٰن مرتضیٰ کے الفاظ میں ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ:

> اخبار ایک ذریعۂ اظہار ہے جو مثبت اور منفی دونوں طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔ یعنی اخبار سے جہاں قومی ترقی، ملکی بہبود، عوام کی رہنمائی اور حکام کی ہدایت کا کام لیا جاسکتا ہے۔ وہاں یہ بگاڑ کا بھی ذریعہ بن سکتا ہے..... سرسید اخبار کی معاشی خود کفالتی کے پہلو کو پوری اہمیت دیتے ہیں تاہم اسے نظر انداز کیے بغیر وہ اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ محض پیسے کی خاطر اخبار کو غارت گر اخلاق و ایمان نہیں بن جانا چاہیے (۸)۔

سرسید نے ان خیالات کا اظہار ''رفیق ہند'' لاہور کے پہلے شمارے میں شائع شدہ اپنے تہنیتی مضمون میں کیا۔ ایک اور مضمون میں انھوں نے اخبار نویسوں کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

> ایک معزز اخبار نویس کا یہ کام ہے کہ وہ گورنمنٹ کی تدابیر کی نسبت معقول طور پر نکتہ چینی کر کے صلاح نیک دے اور مختلف معاملات کا ذکر کر کے عوام کی تربیت کرے اور لوگوں کی رایوں میں ایک عمدہ اتفاق پیدا کر کے ان خرابیوں کو

رفع کرے جو ان کی حالت معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں۔ پس اخبار کے لکھنے والے کے فرائض تین قسم کے ہوتے ہیں یعنی وہ صلاح دینے والا اور تربیت کرنے والا اور لوگوں کی حالت معاشرت کی اصلاح کرنے والا ہوتا ہے۔ پس اس نظر سے اخبار کے لکھنے والے کے فرائض نہایت مشکل ہوتے ہیں (۹)۔

سرسید کا یہ تصور کہ اخبار لوگوں کی رایوں میں عمدہ اتفاق پیدا کرتا ہے، درحقیقت وہی بات ہے جو آج اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ اخبارات کا وظیفہ رائے عامہ کی تشکیل ہے۔ پروفیسر مرتضیٰ کی یہ بات صحیح ہے کہ سرسید برصغیر کے پہلے صحافی ہیں جنھوں نے عملاً اخبارات کو محض ذریعہ ابلاغ نہیں بلکہ ''ذریعہ ابلاغ عامہ'' کے طور پر پہچانا۔

سرسید کے نظریۂ صحافت میں آزادیٔ رائے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ انگریزی حکومت سے خیر خواہانہ مراسم کی استواری کے باوجود انھوں نے صحافت پر پابندیوں کو کبھی برداشت نہیں کیا۔ ان کے خیال میں:

رایوں کا بند رہنا خواہ بہ سبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بہ سبب اندیشہ برادری و قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے یا گورنمنٹ کے ظلم سے ہو، نہایت ہی بری چیز ہے۔

رائے کا انسانی دل و دماغ میں گھٹ کر رہ جانا کیوں بری چیز ہے؟ اس بارے میں ایک اور موقعے پر انھوں نے ایک عمدہ تشبیہ سے اپنی بات کی وضاحت کی:

انسان کا دل مثل ایک ایسے بند مکان کے ہے جس میں آگ جلائی جاوے اور زبان اس کی مثل اس منفذ کے ہے جس میں سے دھواں نکلتا رہے اور اس کی فریاد اور شکایت آمیز خیالات ایسے ہیں جیسے کہ آگ کے شعلے۔ پس اگر کسی مکان میں آگ جلائی جاوے اور اس کے دھویں کا منفذ بند کرلیا جاوے تو ضرور ایسا مکان دھویں کے حبس سے اندر سے تیرہ و تار ہوجاوے گا اور آخر کار وہ بڑے فساد کا باعث ہوگا اس طرح اگر انسان کے دل میں کسی قسم کے خیالات پیدا ہوں اور اس کی زبان بند کردی جاوے تو ضرور ان خیالات کا بخار اس کے دل کو خراب کردے گا (۱۰)۔

یہ بھی سرسید کا اختصاص ہے کہ وہ اپنے خیالات، تصورات کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے خیالات کا قوم کی مخالفت کے خوف سے گلا نہیں گھونٹا۔ آزادی رائے کا ان کے دل میں اتنا احترام تھا کہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں انھوں نے اپنے سیاسی معتقدات کی تردید کرنے والے مضامین شائع کیے۔

سرسید اخبار نویسوں کو محض اخبار نویس ہونے کی وجہ سے کسی خصوصی رعایت یا قدر و منزلت کا مستحق سمجھنے کے سخت خلاف تھے۔ آج کی طرح انیسویں صدی کے صحافیوں میں بھی خود کو عام سطح سے بلند اور خلق خدا سے برتر سمجھنے کا خناس موجود تھا۔ چناں چہ ۱۸۷۶ء کے دربار دلی میں جب ثقافتی طائفے کو ایڈیٹروں سے پہلے بٹھا دیا گیا تو اخبارات نے قیامت برپا کردی۔ "کوہ نور" جیسے سنجیدہ اخبار تک نے اس پر احتجاج کیا۔ پٹیالہ اخبار کے استفسار پر سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایک مضمون لکھا۔ اس مضمون میں انھوں نے ایڈیٹروں سے پوچھا کہ اگر کوئی ایڈیٹر فرض کیجیے وہ نالائق اور عزت و احترام سے محروم ہے تو صف اوّل میں بیٹھنے سے لائق ہوجائے گا اور لائق و معزز ایڈیٹر پچھلی صف میں بٹھائے جانے سے نالائق و بے عزت ہوجائے گا۔ اس سوال پر سرسید کا اپنا جواب تھا کہ صدر ہرجا کہ نشیند صدر است (۱۱)

سرسید اخبارات اور صحافیوں کو عام انسانی، اخلاقی اور قانونی معیارات اور ضابطوں کا پابند سمجھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے اپنے زمانے کے اخبارات کے اس طرز عمل پر سختی سے گرفت کی کہ وہ اخبار بغیر طلب کیے خریداروں کو روانہ کردیا کرتے تھے اور پھر چندہ لینے کو ان کے سر ہوجاتے تھے۔ سرسید نے لکھا کہ یہ طریقۂ کار قانوناً، اخلاقاً اور شرعاً ناواجب ہے کیوں کہ کسی کو زبردستی خریدار نہیں بنایا جاسکتا (۱۲)۔ مختصراً یہ کہ سرسید نہ صرف نظری سطح پر صحافت کی ذمہ داریوں اور فرائض کا واضح تصور رکھتے تھے بلکہ بہ حیثیت صحافی عملاً ان پر کاربند بھی تھے اور انھوں نے ان ہی حوالوں سے اپنے عہد کی صحافت کی تطہیر و اصلاح کی کوششیں بھی کیں۔

حواشی:

(۱)۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے کوائف کے لئے اصغر عباس کی تحقیقی کتاب ''سرسید کی صحافت'' (مطبوعہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۷۵ء) کو پیش نظر رکھا گیا۔

(۲)۔ ابواللیث صدیقی، ۱۸۷۲ء میں اردو اخبارات کی حالت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ، ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء۔

(۳)۔ میسور اخبار، بنگلور، یکم اپریل ۱۸۷۳ء

(۴)۔ سید احمد خاں، ''مقالات'' حصہ دوم، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی (مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء) ص ۱۱۴-۱۱۵

(۵)۔ عابد رضا بیدار، اردو کے اہم ادبی رسالے اور اخبار (رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز، ۹ ۱۹۶ء)، ص ۱۲-۱۳

(۶)۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، منقولہ از اشرف الاخبار، دہلی، ۱۱ مئی ۱۸۷۶ء

(۷)۔ صدیقی، محولہ بالا، ص ۸۹-۹۰

(۸)۔ متین الرحمٰن مرتضی، سرسید صحافت کا ایک مکمل عہد، ابلاغیات، کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۱۴-۱۵

(۹)۔ اصغر عباس، سرسید کی انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی اہمیت، قومی زبان کراچی ستمبر ۱۹۸۵ء، ص ۱۵

(۱۰)۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، بحوالہ اشرف الاخبار، محولہ بالا

(۱۱)۔ سید احمد خاں، مقالات، ص ۲۳

(۱۲)۔ ایضاً، ص ۱۹

***

دکتر اخلاق احمد آهن

ارتباط تمثیل به سبک هندی وقهر مانان سبک هندی

صائب و بیدل

تمثیل یعنی چه؟

درابتداء انسان برزمینه تجربیات ذاتی قصه ها وداستانها راساخت و چیزی که بالاتر از نیروی فهم او بود، آنرا بشکل فوق العاده از تجربیات خود هم آهنگ کرد. انسان مملواز احساسات خوف وحیرت و مسرت گردش آفتاب و ماهتاب دید و اندیشید که در آنان نیز زندگی وجود دارد. از این رو تابش و درخشندگی ستارگان رابطور درخشندگی چشمان دیوها پذیرفت وهفت ستاره را گاهی بحیث خرس[1] وگاهی رشی (صوفیان هندوقدیم) درک می کرد. از ایز وقصه های "پنچ تنترا" وحکایات لقمان حکیم رابشیوه فابل (Fable) وپارابل (Parable) بیان کردند وبدین طور بعداً همین سبک وشیوه بشکل تمثیل باوج رسید.

شاعر یا نویسنده نه تنها از راز نیرنگهای حسن وطبیعت متاثر می شود بلکه از مشابهت ومطابقت طبیعی بین دوشئ رامحسوس می کند، وبرای اظهار کردن این احساس پنهان کمک ازشئ دیگرمی گیرد وبیان می نماید مثلاً چهره خوبرورا ازگل، دلیر بودن راازشیر وعاشق راازپروانه. حقیقت اینست که تشبیه وتمثیل راه افهام وتفهیم راآسانتر می کند ونیز برذهن واحساسات انسانی تاثیرعمیقی می گذراد.

بدیهی است که سخن ساده وراست در ذهن انسانی هیجان برپا نمی کند. شبلی استعاره راشیوه طبیعی می گوید وهمین طور متنبّی می گوید که "فان فی الخمر معنی لیس فی العنب" ورومی بلخی می گوید که:

خوشتر آن باشد که سرّ دلبران
گفته آید در حدیث دیگران

بدین جهت، سخنوران ونویسندگان نامور فارسی وادبیات زبانهای دیگر باتوسل به تمثیلات گوناگون وایراد حکایات مختلف مقاصد واهداف خودرابرای مردم عادی بیشتر وبهتر روشن ساخته اند. مثلاً اشترنامه منسوب به عطار تمثیل شتری است که درراه مکه رو به کعبه درتکاپواست ودرآن هجران وجویای روح رانسبت به خداوندتعالی، بیان می کند. برخی ازآثارخواجوی کرمانی وقسمتهایی ازترجمه فرج بعداز

شدت از حسین ابن اسعد دهستان وموش وگربه عبید زاکانی شاعر ومنتقد اجتماعی معروف نیز در قالب تمثیل بیان گردیده است.

حقیقت اینست که "اشاره" (sign) پس از نمودار تقاع "علامت" (symbol) می شود ولی چون علامات از معیار اعتبار می افتند فقط بطور "اشاره" باقیماند، ارین در کتاب خود بعنوان 'language and reality' می نویسد که:

"همه علامات نشانات (Emblems) هستند ولی همه نشانات علامات نیستند (۲) که بسوی مشارالیه توجه می کشانند وشکل سوم نشانی ذیلی، (sign Substitutional) است که اغلباً در ریاضی وامور دینی بکار برده میشود، مثلاً برای اضافه (+) یا برای منها (-) وهمینطور صلیب[۲] که نشاندهنده قربانی ودار ورسن وابتلاء است[۳]"

به همین سبب "نشان" کوائف اخلاقی وروحانی را به حسن وخوبی بیان می نماید. نشانی که معنویت عمیق می دارد، آنرا symbol یا علامت میگویند. سرریالیسم (surrealism) که سرچشمه آن، لاشعور ما می باشد وسرورموزهای آن را ابراز می کند که آنها را رسوم وقیوم فرهنگی واجتماعی وبندشهابی مکارم اخلاقیات وعادات در چنگهای خود گرفته اند وهمه در حصار لاشعور مقید شده اند. می نویسد:

"در سرریالیسم تمثیل تنها مشابه به حقیقت نیست بلکه بذات خود حقیقت است"[۴][۵] دکتر سلام سندیلوی تمثیل را "رمزیه" می گوید ومی نویسد که: "رمزیه، یک صنف سخن است که بزبان انگلیسی آنرا Allegory می گویند[۶]"

ولی این هر دو تعریف تمثیل که در سطور بالا مذکور شد، درست نیست زیرا که "رمزیه" اصلاً صنف سخن نیست، در آن اصطلاح که قصیده، مثنوی، رباعی یا غزل می نویسیم از این رو، تمثیل صنعت است ومیان صنف وصنعت فرق است. دوم این که Allegory را تمثیل می گویند نه که رمزیه.

غلام سرور لاهوری تماثل وتمثیل را بمعنای مشابه شدن، هم شکل شدن، مثال دادن و "تمثال" بمعنی صورت و "تمثال گر" بمعنی مصور نوشته اند[۷] او در رابطه اشعاری از صائب وسعدی را بطور ثبوت آورده است:

صائب:

دین و دل را می دهی* بر آب تا دم می زنی
بار تمثیل کرم بر نام حاتم می زنی

سعدی:

چنان صورتش بستہ تمثال گر
کہ صورت نہ بندد ازان خوبتر

واژہAllegory واژہ مرکب است و از دو واژہ یونانی Allos بمعنی "دیگر" و Agorevein بمعنی" گفتن"یعنی درآن ازسخنی سخن دیگررادرک می کنند.

دراینجاذکراین نکتہ لازم بہ نظرمی رسدکہ فرقMyth(اسطورہ)وSymbol(سمبل=نماد، تمثیل)درناخودآگاھی اسطورہ وخودآگاھی تمثیل است دراساطیرخصوصیات روان آدمی بہ اشیاء انتقال می یابدمانندایں کہ گفتہ شود:

"دل سنگ خون می گردد" یا"ابرسخن می گوید" یا"ستارہ آدمیان رامی نگرد" یامانندایں بیت شاھنامہ:

بہ سوگ سیاوش ھمی جوشد آب
کند چرخ نفرین بہ افراسیاب

از این روتمثیل، اسطورہ ای است کہ از مرحلہ ناخودآگاھی بہ جھان خودآگاھی آمدہ است. اما اسطورہ سازی تنھا کاربشرنخستین نیست، درروزگارمانیزشاعرزیروبم ھای روان رابہ اشیاءبی روح انتقال می دھد وبااین کاربہ طورخودآگاہ اسطورہ می سازد. ضمناً بایدیادآورشدکہ اسطورہِ درتماس باتاریخ، مدام از حالت خویش خارج می شودوبہ مرتبہ تمثیل می رسدواین یکی ازخصوصیات تفکرآدمی درعصرجدیداست.

از بحث وبررسی اصطلاح تمثیل کہ دراقتباسات مذکورآمدہ است. نکاتی مھمی مربوط بہ آن ازینقرارمی باشد:

اول:تمثیل صنعتی ھست یابقول سی. ایس. لیوس(C.S.Levis) یک شیوہ اظھاروبیان است(Allegory is a mode of expression)(۸)

* دھی کے بجائے دہی بہتر ہوگا، اسی طرح پورے مضمون میں

دوم: این بیان مسلسل است که در واقعات واستعارات طولانی بیان میشود و در آن پیچیدگی و معنویت عمیق است.

سوم: توسط تمثیل، به لباس مرئی غیر مرئی و در پرده غیر مرئی مرئی را پیش می کنند[۹]. یعنی توسط تجسیم و تشخیص جذبات و اوصاف و اشیای مجرد در واقعات تسلسل و پیوستگی می دهند. گاهگاهی توسط حیوانات و واقعات و تجربیات و تصورات بشری را ابراز می نمایند.

چهارم: تمثیل تجسیم و تشخیص (Personification) نیست واقعات تمثیلی بر دو سطح حرکت می کنند. سطح بالائی، آن که بیانیه یا داستانوی دارد و سطح پائینی آن که با تصورات مخصوص مربوط است و میان هر دو سطح مذکوره یک ارتباط عمیقی و معنوی وجود دارد ولی در نتیجه مدوجزر در سطح زیرین نیز ارتعاش بر سطح بالائی بنظر می خورد.

پنجم: در تمثیل یک تصور مرکزی می باشد که هدف آن اغلبًا اخلاقی است که تمام کردارهای قصه یا داستان به تعقیب آن پیش می روند.

ششم: گرچه در هر دو سطح کردار و قصه های تمثیلی ظاهراً مبهم می باشد ولی در آن تشابه و اشاره و قرینه معنوی وجود دارد.

هفتم: در کردارهای تمثیل به جای فردیت، اجتماعیت انعکاس می یابد و نیز باید تمام ریشه در ارتباط با مفکوره مرکزی مشابهت و مماثلت باهم داشته باشند.

هشتم: تمثیل نیز هدفی دارد که اغلبًا مربوط به اخلاق و پند می باشد. گاهگاهی برای تفهیم مسائل پیچیده تصوف تمثیل را بکار می برند.

نهم: تمثیل با شیوه و سبک مخصوص مربوط نیست بلکه می تواند در نثر مسجع و مقفی و هم در نثر ساده و هم در شعر بیاید.

دهم: تمثیل گاهگاهی ابعاد زیاد ولی معمولاً دو سطح دارد و هم وابسته به موضوعات گوناگون مانند سیاست، دین، اجتماع، فلسفه، اخلاق، شعر و ادب می شود.

هدف تمثیل و مشخصات آن

در تمثیل یک مفکوره مرکزی لازم است که در تعقیب آن همه کردارهای قصه یا داستان پیشرفت و توسعه می یابند. معمولاً گاهی این فکر مرکزی مربوط به فلسفه و اخلاق می شود و گاهی هم سیاسی و ادبی

می باشد. اغلب تمثیل ها مربوط به نکات اخلاقی می شوند، بهمین سبب، هنر تمثیل را وابسته به مکارم اخلاق، فرض کرده اند، اگر چه این گونه نیست.

اصلاً هدف تمثیل ترسیل وترویج آن گونه افکار واحساسات وتصورات است که مستقیماً در ذهن ما نیایند واگر آن را درک بکنیم، درآنصورت اثر ونفوذ بر دل اثر نمی گذارد، طوریکه توسط تمثیل ممکن است. علاوه براین یک نوع پرده پوشی هم لازم است یعنی سر دلبران باید" گفته آید در حدیث دیگران" نویسنده هر موضوع را اینطور پیشکش می کند که از خاطرات آمده خود را محفوظ یکند. سی. ایس. لیوس (C.S.Levis) می گوید:

"این گفتن درست نخواهد بود که برای پیش کردن کائنات داخلی وسیله وطریق دیگر هم است یا به شکل نمایشنامه ورمان دریافت شده است. برای موفقیت درهدف اخلاقی فقط مطالعه باطن یا مشاهده نفس نتواند که نقاب کشای سیرت وکردار بکند".(۱۰)

به این ترتیب که درسطور بالا مذکوره شده است هدفی تمثیل هم نهفتن و پرده پوشی است وظاهر است که برهنه حرف نگفتن، هم کمال گویای است. چنانکه می بینیم، تمثیل همیشه دراسلحه خانه ادیبان وجود داشته است وآن ها درجهت بدست آوردن هدفهای مختلف النوع از این بکار می برند. گاهی برای نقد و طنز حریفان سیاسی گاهی توسط این شاعران وادیبان معاصرین خود را تحت طعن وتشنیع سخت خود می آورند و گاهی برای درک کرانیدن پیشرفت علوم گونا گون وهمین طور درسراسر تاریخ وزبان وادبیات فارسی وقتی تحول وتغیری بوقوع می پیوندند، آنوقت شاعران وادیبان به موافقت و نیز به مخالفت آن آله تمثیل را استعمال می کنند.

ارتباط تمثیل به سبک هندی

''اهل منطق تمثیل را اثبات یک حکم واحد درقضیه جزئی به واسطه ثبوت آن در جزئی دیگر که با اول معنی مشترکی دارد، تعریف کرده اند وفقها این را قیاس می خوانند وجزئی اول را فرع، جزئی دوم را اصل و معنی مشترک بین این دو را علت و جامع می گویند. گرچه استخوان بندی تمثیل شعری نیز همین استخوان بندی منطقی است ولی باید درنظر داشت که درشعر، مصرعها دراصل ازمقوله هستند ونه"(۱۱)

تمثیل خیلی مربوط به سبک هندی است. سبک هندی اصطلاحی است برای شعر فارسی که در

قرن دهم و یازدهم در مقابل شیوه خراسانی و یا سبک عراقی و شیرازی متداول و رایج گردید. اگر چه بعضی محققان زبان و ادب فارسی مخصوصاً امیری فیروزکوهی با این اصطلاح موافق نیستند و برآنند که باید آنرا سبک عهد صفوی نام نهند.[۱۲] اینجا یادآوری ضرور است که علاوه به خصوصیات و مشخصات دیگر سبک هندی، استفاده فراوان از تمثیل و ارسال مثل و اسلوب معادله و مضمون سازی و جست و جوی معانی بیگانه از طریق تشخیص و حسامیزی و نیز لقب زدن از ظاهر به باطن یا برقرار کردن ارتباط بین محسوس و نامحسوس است. شاعر سبک هندی به هنگام کاربرد شیوه های مذکوره از طریقه های گونا گونی دست می زند ولی توجه خاص به عنصرها و پدیده های طبیعی و آداب و رسوم و عادات و اصطلاحات و تلمیحات اجتماع و تجربیات و مشاهدات انسانی در نظر می دارد. مثلا شاعر سوختن چراغان را در شب مهتابی تجربه می کند. اگر چه شمع خود را تمام شب می سوزاند ولی فایده ندارد و نتواند توجه هیچکس را بطرف آه و سوزش خود بکشاند. شاعر در فکر خود بین این پدیده ها محسوس با یک حالت نامحسوس ارتباط می دهد و در شعر خود این وضعیت ذهنی را می آورد. چنانکه می گوید:

سوختیم و سوزش ما بر کسی ظاهر نشد (نامحسوس)
چون چراغان شب مهتاب بیجا سوختیم (محسوس)

این گونه روش سخنوری در سبک هندی فراوان به نظر می خورد. مثلاً:

طالب آملی:

چون صبح عید قربان حله کافور سان پوشد
زمین از خون قربانی شفق گون پرنیان پوشد

عرفی:

ازین پیام دلم شد شگفته و شاداب
چنان که باغ ز شبنم چنانکه گل ز نسیم

نظیری:

تهی دارم ز طوفان حوادث
چو کشتی در ته دریا شکسته

طالب آملی:

تیغ در برهنگی فاش کند جوهر خویش
مصلحتهاست در این شیوه عریانی ما

گاهی تمام اشعار غزل این شیوه پراز "محسوس و نامحسوس" بنظر می خورد. مثلا یک غزل استاد خلیلی:

پیر گردیدم ولی آه مرا تاثیر نیست
آن کماندارم که در ترکش مرا یک تیر نیست
زندگی چون بار شد تدبیرش از میخانه جو
وای بر شهری که آنجا بار هست و بیر نیست
دل بجز زلف گرهگیر تو آرامی نداشت
چاره دیوانه جز در بند این زنجیر نیست
مرگ را نازم که از غفلت رها سازد مرا
خواب ما آشفته حالان را دگر تعبیر نیست
وقت چون برق شتابان میرود هشیار باش
چرخ را بهر من و تو فرصت تاخیر نیست
کوه کن بر کلک شیرینکار من خواند درود
زانکه داند طبع من کمتر ز جوی شیر نیست(۱۳)

اشعار مولانا جلال الدین بلخی از لحاظ شیوه تمثیل پردازی بسیار مهم است و سبک هندی در زمینه تمثیل پردازی اغلب تقطیر و استخراج مولانا بنظر می رسد یا به صورت دیگر اگر اشعار سبک هندی شرح و تحلیل و تجزیه میشود، چیزی نزدیک به مثنوی مولوی حدیقه سنائی و منطق الطیر عطار و دیگر کتابهای مشابه عرفانی بدست می افتد که اساساً مایه و هدف عرفانی داشته باشند.

بیشتر از اشعار شاعران سبک هندی به دلیل ویژگیهای خاص این سبک، پیچیده و دور از ذهن می نماید و پیروی یک فرمول سنتی و یک راهه سر بر می تابد، لذا در میان مردم پذیرفته نمی شود چنانکه بهار می گوید:

فکرها سست و تخیلها عجیب
شعر پر مضمون ولی نادلفریب
و ز فصاحت بی نصیب
هر سخنور بار مضمون می کشد
رنج افزون می کشد
زان سبب شد سبک هندی مبتذل(۱۴)

این دسته از خوانندگان شعر- که تعدادشان هم کم نیست- از این مهم غافل اند که شعر راز سر به مهری است که خواننده و شاعر، هر دو در افشای آن سهیم اند از این رو کار شعر را در همین مرحله سروده شدن توسط شاعر، خاتمه یافته می انگارند و از بذل عنایت و توجه و احساس در رویارویی با شعر، با بی حوصلگی و تنبل منشی خاص خود، دریغ می ورزند. اینان با شاعری که اندک فاصله ای از سطح می گیرد و به سوی ناشناخته ها نقیب می زند و در شکل و محتوا "طبق معمول" های رایج را به دیده تحقیر می نگرد، با تر شرویی و گاه با پرخاش روبرو می شوند و برای فرونشاندن عصبانیت خود به کنجی پناه می برند و با خود زمزمه می کنند که:

مرغ نر را خروس می گویند
زن نو را عروس می گویند
آنچه در چشم می رود خواب است
وآنچه در جوی می دود آب است(۱۵)

اما حقیقت این است که دسته شاعران از این سبک شعر نیز مانند پیروان سبک خراسانی و عراقی خوگران وزن و قافیه هستند، زیرا که این سبک به هر حال در زبان و محتوا گاه آنچنان نقاط ضعفی از خود ابراز می نمایند که حتی سرسخترین مخالفان سبک هندی نیز صورت موجهی به خود می گیرد. ولی این نکته باید در نظر داشت که پیچیدگی های اشعار سبک هندی را ضعف آن دانستن، کوتاه نظری است. و اینگونه اشعار بیدل و مخصوصاً غزلیات او که با وجود عیوب سبک هندی دارد ولی خوبی و حسن نهفته اصلی پیچیدگی شعرش آن است که او با مهارت بی سابقه مفاهیم عرفانی و فلسفی را می آمیزد و به طریق سبک هندی تجسیم و تشخیص آن را می کند.

در اختصار می توان گفت که سخنسرایان این سبک معمولاً به ابداع مضمون و آوردن تشبیهات تازه و تجسیم و تشخیص مطالب علاقه فراوان دارند و شاید به همین علت فصاحت و سادگی را از دست داده اند و

عموماً شاعران این دسته بدنبال سرودن شعر پر از باریک خیالی، تصورات دقیق و گاهی دور از ذهن و اغراق ومبالغه تعقیب می کند. سخنوران سبک هندی می خواهند مضمون تازه ای بیاورند یا تخیل بسیار دقیق و ظریفی را قالب لفظ پوشانند ولی بسبب محدودیت واژه ها به استعاره روی می آورند واینطور کار دشوار می شود. و دیگر فرصتی برای جستجوی کلمات مناسب ومجال برای دقت در جمله بندی برایشان باقی نمی گذارد. بنزد شاعران این دسته قصد اصلی آفریدن مضمون ناگفته می باشد واز این رو سخن ساده وروشن را نادیده می کند.

در اشعار سبک هندی اتفاق برای عیار خلاقیت بیشتر از دیگر سبک های شعر فارسی می افتد، شاعر در کشف معنای ومطالب نایاب ودور دراز دست می زند وبا نوعی ریاضت ذوقی او واژه های دقیق، کلمات بلند پایه، اصطلاحات، تلمیحات وقصه های معروف نیز تناسخ معنوی می یابند واز لذتی روحی نو آشنا می شوند. صائب می گوید:

در غریبی آشنا از آشنا هرگز نیافت
لذتی کز معنی بیگانه می یابیم ما

در جهت رسیدن به این تناسخ و بدست آوردن این تسکین لطیف، علاوه بر دیگر شگردهای برجسته سبک هندی، صنعت تشخیص بخصوص به استعمال می رود. مثلاً صائب شبنم (خودش) را سیر چشم و بی اعتنا به آغوش گشاده شاخ گل (تعلقات زمینی) قلمداد می کند وآن هم از طریق تشخیص:

سیر است چشم شبنم من، ورنه شاخ من
آغوش باز کرده صلا می زند مرا

مکانیسم یک عمل خیال درین است که شاعر یک حادثه مثلاً داستان حضرت ابراهیم علیه السلام را در نظر می گیرد. زندگانی حضرت ابراهیم خود نشیب وفرازهای بسیاری دارد همچون بحث با ستاره پرستان ورد عقاید این گروه گذاردن زن وفرزند در بیابان بی آب وگیاه، شکستاندن بتها وگرفتار خشم نمرود شدن وبه قربانگاه بردن فرزند خود ودیگر حوادث اصلی وفرعی که در زندگی حضرت ابراهیم مطرح شده اند.

متصف کردن اشیا وابزار گوناگون به صفات انسانی یا صفاتی که در ظاهر نمی تواند به آنها تعلق داشته باشد، در اصطلاح تشخیص بر وزن تفصیل در زبان عربی علاوه بر مفهوم مشهوری که در فارسی دارد، معانی مجسم سازی، تجسم وشخصیت دهی، را نیز حامل است.

شاعر هم می تواند زندگی آن بطل جلیل را بکلی در نظر بگیرد وتمام حوادث زندگیش را اشارتاً

نشان بدهد و حادثه های خاص را بخصوص تماشا فرا بخواند و معمولاً در حالت اخیر است که خیال در شعر سبک هندی جوهره اصلی خود را نشان می دهد و چیز های نادیده ای را برای دیگران دیدنی می کند.

اینجا یادآوری یک نکته هم ضرور است که حضرت ابراهیم بحیث پیغمبر خدا در دنیا آمده است و او را باید که طلای مجسم باشد که برای خالص شدن یا محک خوردن با مشیت خدا و به دست نمرود در بوته آتش می رود و خالص و صافی و سربلند از آن بیرون می آید در اینجا توکل و للهیت ابراهیم و عمق و ریشه آن می توان نقش طلای محک خورده را به عهده بگیرد.

اما فارسی زبانان به هنگام بکار بردن از اصطلاح تشخیص و تجسیم مواجه به مشکل می شوند، زیرا که تشخیص و تجسیم در زبان فارسی تنها رساننده مفهوم و امتیاز چیزی از چیز های دیگر است. ولی کثرت استعمال این اصطلاح در منتهای ادبی معاصر و قرار دادن آن در برابر واژه انگلیسی "Personification" کم کم معنی دومی برای این اصطلاح در زبان فارسی آمده است.

در پایان بحث و تحلیل خیال در شعر سبک هندی باید یادآوری بشود که فرهنگ واژه ها و جهات و ابعاد گوناگون یک کلمه یک چیز با یک حیوان یا هر پدیده دیگر بطور جدی در مشاهده شاعر سبک هندی می آید و او به هنگام بوجود آوردن مضمون از همه از اینان لازماً بکار می برد. اگر یکی از مشخصات تیغ آبدار بودن است. شاعر سبک هندی در آب این تیغ می تواند شناوری بکند. در اینجا تصادفات زیادی و مختلف النوع هم امکان دارد بمعنی ممکن است شاعر عکس خود را در آن ببند و هم امکان دارد که عاشق در آب تیغ معشوق بقتل برسد و هم از آن آب بقول عبدالقادر بیدل می تواند عاشق شهید وضو بکند اگر چه سیراب شدن از آب تیغ مضمون پایمال شده در زبان فارسی است:

ما شهیدان را وضویی داده اند از آب تیغ
سجده آموز سرِ ما نیست جز محراب تیغ

همچنین آشنایی و آگاهی با خصوصیات آن حیوانان که شاعران این سبک در محیط خویش دیده اند، در جهت فهمیدن رنگارنگی خیال شاعران سبک هندی لازم است. حیوانان در اشعار شاعران این دسته، عجیب بنماید و گاهگاهی حتی مانع از درک تمثیل مورد نظر شاعر بشود۔

قهرمانان سبک هندی-صائب و بیدل

پس از خواندن این عنوان سؤالی در ذهن می آید که چنین لقبی به کدام یکی از آنان داده شود و

کدام بیشتر به این می پردازد- صائب یا بیدل؟

در این هیچ تردید و اشتباه نیست که صائب شاعری نامدار و دارای سبک خاصی است- بخصوص از دیدگاه غربیان که به دور مضمون چکر می زنند و مفهوم و مطالب شعر بیشتر در ذهشان جلوه می کند- و صائب هم از این لحاظ قهرمان بی همتا است کمتر شاعری بدین حد مضمون و معانی مختلف آفریده است ولی سبک هندی را اگر از لوازم و جهات گونا گون آن در نظر آوریم، بیدل بطرز خاصی و تمیز خود از "فضای مه آلود گمنامی" (علاوه بر افغانستان و تاجیکستان که آنجا سراسر قرنهای گذشته وحتی در زمان معاصر توسط شاعران و دانشمندان مانند صلاح الدین سلجوقی، استاد خلیل الله خلیلی، صدرالدین عینی وغیره پذیرفتگی زیاد گرفته است) سر بیرون آورده "مدال قهرمانی" را دعوی می کند، ولی دوباره پرسش اولین در ذهن می آید میان صائب و بیدل کدام سزاوارتر است؟

بیدل شاعر پر مایه وقریحه منداست. شعر او شاهکار زنده فرهنگ مغول است حتی امروز با وجود اینکه قالب زبان دگرگون شده است ولی به سبب شفافیت ورایحه خوش شعرش، هنوز وجدان ما از آن نورانی وعطر آگین می شود. این نکته را هم باید در نظر داشت که بیدل شاعری کثیر التالیف است. دیوان او بیش از صد هزار بیت از غزل وقصیده ورباعی ومثنویات برآورده است که برای مطالعه تفصیلی او کمی خون جگر لازم است. اما اشعار او عموما پر فهم، پیچیده ودشوار ابپ فیسور نبی هادی (استاد بازنشسته دانشگاه علی گر) می نویسد:

> در کلام منظوم بیدل از آغاز تا انجام نکاتی مهم چون: سنجیدگی افکار، سنگینی بیان، ابهام واغراق در اسلوب چنان زیاد است که واقعه فیلسوف آلمانی، کانت به خاطر می آید. کانت، فیلسوف آلمانی، تالیف خود را برای مطالعه به دوست خود سپرده بود. وی آن تصنیف را تا نیمه خواند وباز پس داد. چون کانت از او در باره کتاب خود نظر خواست گفت: در ذهنم خشکی پیدا شده است وبیم آن می رود که دیوانه شوم.(۱۶)

همین علت است که اگر چه بیدل شاعریست لبریز از تخیل وسرشار از تشبیهات واستعاره های تازه وغریب ولی با وجود مجهز شدن این همه اوصاف وخوبیها دیوانش در ایران زیاد محبوبیت نیافته است. مثالها هم است که اشعارش پر از موسیقی وسادگی مملو است ولی اینگونه شعر گاهگاهی بنظر می خورد، بیشتر از هنر کاریهای بیدل غریب ودور از ذهن عامه است و بیدل مسحور ومفتون که در پیچ وخم تصورات خود

گم و ناپدید شده است. می خواهد آن را برای دیگران شرح دهد. به گمان می رسد فرق بین صائب و بیدل همینجا است. بنابر اصطلاح جدید بیدل درونگرا است وصائب برونگرا. بیدل همیشه به بخش دادن اندیشه ها وتصورات خویش است و برجسته صائب این است که از حادثات ومشاهدات پیرامون خود استخراج مایه می کند.

درسخن بیدل اختصاصات دومین به فراوان بنظر نمی رسد وآشنای با سبک هندی و وابستگی به تشبیهات غریب واستعاره های پیچیده وتمثیل کار را سهل می سازد:

زهی چمن ساز صبح فطرت تبسم لعل مهر جویت
ز بوی گل تا نوای بلبل فدای تمهید گفتگویت
به این ضعیفی که بار در دم شکسته در طبع رنگ زردم
به گرد نقاش شوق گردم که می کشد حسرتم به سویت

مفهوم این دو بیت روشن است. در بیت اول اومخاطب به محبوب است ومی گوید که براثر تبسم محبت آمیز تو صبح ازل چمنی سرسبز رایه کرد. از بوی گل گرفته تا نوای بلبل همه درتمهید گفتگوی تو، یعنی درکلمه " کن "فدا شدند. در بیت دوم نیز تخاطب به محبوب است که دراین ناتوانی چنانم که طبعم به بار درد شکسته و رنگ چهره ام پریده است. جانم فدای نقاش باد که تصویر حسرت می کشد و به سویت روانه می کند.

بسوی دیگر صائب می خواهد بگوید ظاهر خوشحال وآرام من دلیل به آسودگی وشادمانی باطن نمی باشد ودلیل خود را به کمک یک تمثیل حسی وشهودی متوسل می کند وآنست حنا که رنگ ظاهری آن سبز است ولی رنگ سرخ از آن می آید:

بیرون همه سرسبز و درونم همه خونست
از حالت من برگ حنا را که خبر کرد

خاقانی همان معنی را به جای جمله پست وبازاری "از حالت من برگ حنا را که خبر کرد" درتمثیل دیگری آورده واز جمله بندی اوصلابت هویداست:

غصه تلخ از درون، خنده شیرین زنیم
روی ترش چون کنیم، از گل تر کمتریم

همین مضمون را حافظ بدون تناسبات لفظی خاقانی وآوردن ترش وشیرین وتلخ آورده وبطور

ساده می گوید که خاصّه اوست:

بطرب حمل مکن سرخی رویم که چو جام
خون دل عکس برون میدهد از رخسارم

همین معنی را صائب بشیوه خاص خود آورده، با تشبیهات مخصوص، با مهارت تامه سروده است:

فتنه صد انجمن آشوب صد هنگامه ایم
گر به ظاهر چون شراب کهنه خاموشیم ما

جای دیگر صائب می گوید:

از دهان بسته باشد قفل روزی را کلید
پر بر آید کوزه لب بسته از دریای خم

در اینجا صائب می خواهد از زبان خاموشی سخن بگوید و مکرر بدان توجیه کرده و شاهد یا دلیل را برای آن آورده است ولی این دفعه تمثیلی که می آورد، هر چند بدیع و جالب است ولی نمی تواند دلیل بر سودمندی سکوت قرار گیرد زیرا دلیل رخص از مدعاست.(۱۷)

ولی این هم حقیقت است، صائب پیروی حافظ کرده است چنانکه معترف است که:

هلاک حسن خداداد او شوم که سراپا
چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

صائب بسیاری غزلهای خود را که به پیروی حافظ ولی از لحاظ شیوه سخنوری و نیز مضمون و موضوع به گونه ای دیگر آورده است. از این هویداست که او شیفته بر کلام حافظ است. چنانکه نویسنده "نگاهی به صائب" علی دشتی می نویسد:

"حافظ مقتدای همه سرایندگان سبک هندیست، باریک خیالی، مضمون های بدیع، دقت در تشبیه و استعاره، تاملات و تفکرات ارزنده درباره عالم هستی و محیط اجتماعی و مزایای دیگر این دست حافظ را قبله ادب قرار داده است.(۱۸)

میان صائب و حافظ از لحاظ شیوه سخنوری ارتباط صمیمی است حافظ نیز با مستعارات دست می زند و مطالب خود را به طرز ایهام و غیر مستقیم باز می گوید و روش صائب کاملاً همان است و خود او نیز مطالب

دقیق عرفانی یا دینی یا اخلاقی واجتماعی را با انواع کنایات وتمثیلات وتعبیرات غیر مستقیم آورده است.

نکته افتراق بین این دو شاعر در شیوه بیان است وهمین جاست که صائب از حافظ دور می شود. حافظ در این عرصه از زبان محاوره عامه فاصله می گیرد، درصورتی که صائب در متن محاورات عامه قرار می گیرد. آنهم محاوره عامه ای که سه قرن بعد از حافظ وجود دارد.

یکی از خصوصیات تمیز در اشعار صائب اینست که معمولاً در مصرعه اول کثرت تمثیلها ومضمونهای پیچیده ومبهم می آید که اغلبًا از حوادث زندگانی ومشاهدات پیرامون خود او مایه گرفته است ولی خوبی در همین است که پیچیدگی معنوی مصرعه اول در مصرعهای دیگر روشن می شود وهمین اختصاص شیوه اش است که شعرش را وسعت تخیل می بخشد واز این لحاظ اشعارش نزدیک مولوی وخاقانی سیر می کند.

بعد از مشاهده کثرت مضمونهای غامض وپیچیده غریب که در ضمره آن اشعار عالی قدم اول همین تنوع است؟ اما حقیقت این است که شاعر حقیقی پس از گذشتن احساسات روانی ونفسانی مانند عشق ودلسوزی، درد وفرحت، بیم ورجا، فراق ووصال، نفرت وکین باز این را در صورت اصلی وطبعی وبه شیوه ساده در شعر خود می پذیرد ولی شاعران مانند صائب وبیدل آن را توسط تمثیل بیان می کنند.

با آنکه شعر بیدل دارای رنگ وبوی آفاقی است اما می توان شیوه بیدل را سبک هندی چند گونه ای یا هندی عمیق بنامیم. بیدل به نگرش هندی وبه ابزار وآلات سخن گفتن در این سبک توان وکارآیی بیشتری می دهد ودر اشعار خود معانی وفواید بسیار بیان کرده است. از عنوانهای آن می توان به مباحث آن پی برد. مثلاً: دبستان صنع، یاد رفتگان، نغمه وحدت، بهارستان جنون، هجوم حیرت وبالآخره خموشی وسخن، و این در حالی است که تمام فنون وشگردهای خیال بندی ومضمون آفرینی در این سبک را به خوبی آموخته واز تجربیات ومشاهدات شاعران برجسته مانند کلیم وصائب نیز استفاده زیادی کرده است. اما این هم به نظر می رسد که همه موضوعهای ذکر شده در حالت پراکنده یی است ونیز بین آنها بی ارتباطی است.

باوجود اینکه او شاعر قریحه مند وقادر الکلام است، اما اشعارش از عیوب سبک هندی مبرا نیست وخیال تناور او اندکی رو به سوی سادگی می نهد حتی در توضیح جزئیات حقیر وروز زندگی، مانند حادثه فرستادن مرباوترشی به وسیله کسی برای فرد دیگر نیز با مخاطب نامه خود کلنجار می رود وزور بازو نشان می دهد. او قادر بود که این مطلب را در دو جمله ساده می نویسد. اما به جای بکار بردن به واژه های ساده راهی پر پیچ وخم را اختیار می کند.

طوری که قبلاً ذکر شد که بیدل درونگراست واز این رو بارزترین صور عاطفی اشعارش اندوه حیرت، استغاثه، خشم، خنده و نیاز ونهیب می شود. وهمین وجدان است که اورا مواجه به تعقید و پیچیدگی می کند. پروفسور نبی هادی می نویسد:

"ادبیات مترقی سراسر جهان قاعده ای یکسان دارد. درلحن شاعرانی که تمایلات ماورای طبیعت داشته باشند، ضرورتاً دقت وابهام دیده خواهد شد. علت این است که این شاعران به هنگام آفرینش هنری از سطح خاص تخیل خود فروتر نمی آیند". (۱۹)

اما درشیوه سخنوری بیدل خلوص، صداقت و کیفیت فطری همیشه قائم است وتنها تلاش تصنع نیست. او درهنرمندی و پیچیدگی بیان باهنر دیگران مشابهت و پیروی نمی پرداز دوهم نه دیگران موقع می دهد که به تقلید بپردازد. بنابه گفته پروفسور نبی هادی تنها از لحاظ بعضی عناصر فقط دوشاعر یعنی غالب واقبال رامیتوان شاگرد معنوی اوقرارداد.

اکنون پس از یک تحلیل و بررسی اجمالی، درجهات نشان دادن تطور وتکامل تدریجی شعر سبک هندی وافتراق زبان ومحتوای شعر صائب و بیدل، دوغزل اورا از کنار سبک هندی بطور مثال می آوریم که در یک بحر و با یک قافیه سروده شده است، به گمان می رود که اینجا بیدل پیروی صائب کرده است اما از نگرش معنوی درین هم به رنگ خودرا آورده است:

غزل صائب:

در قلزم مَی همچو حبابست دل ما
از خانه بدوشان شرابست دل ما
موقوف نسیم است ز هم ریختن ما
چون برگ خزان پا به رکابست دل ما
از جنبش مبداست گرانخوابی اطفال
از گردش افلاک به خوابست دل ما
چون تیغ برهنه است چو افتد به سرش کار
هر چند که در زیر نقابست دل ما

هر چند که در هر چمن آتش نفسی هست
صائب ز نوای تو کبابست دل ما[۲۰]

و اکنون غزل بیدل:

آئینه چندین تب و تابست دل ما
چون داغ جنون شعله نقابست دل ما
آتش زن و نظاره بیتابی ما کن
جز سوختن، آخر به چه بابست دل ما
لعل تو به حرف آمد و دادیم دل از دست
یعنی به سوال تو جوابست دل ما
حسرت ثمر کوشش بی حاصل خویشیم
از بسکه نفس سوخت کبابست دل ما
تا جنبش تار نفس افسانه طراز است
بیدل به کمند رگ خوابست دل ما[۲۱]

دراین دوغزل تفاوت شعرصائب و بیدل واضح می شود. آن تب وتاب وفراز وفرود که در شعر بیدل است، درشعرصائب بنظرنمی خورد. درمحتوا نیز نیمه زمینی است. ولی شعر بیدل مملواز زبان مرتعش کننده ومتموج است که درمحتوای عارفانه بیان شده است و با ترکیبهای خاص او مانندحسرت ثمر، داغ جنون، متصف ومجهز است. از این روهرغزل نشان دهنده ذوق خاص هردوشاعراست که دوبوی خوش خودرادارد مثلا اشعارصائب حامل احساس فردی است که مبنی برمشاهدات خوداست و به سوی دیگر مضامین بیدل نمایندگی احساسات بنی نوع انسان می کند واز زبانشان به معنای مطلق می آید وسؤال معروف ازلی می آورد:

کس سوال مرا جواب نگفت
ناله در کوهسار خواهم کرد

و به جای دیگر باز یاد معنای عمیق:

لعل تو بہ صرف آمد و دادیم دل از دست
یعنی بہ سوال تو جوابست دل ما

علی دشتی دراین بارہ می نویسد ودرزمان معاصر نبوغ آنان راسراغ می کند:

"شعر بیدل آن "موفقیت" ھمہ جانبہ یعنی رواج شعر صائب را ندارد. ھمان گونہ کہ شعر مولوی نیز موفقیت پردامنہ شعر حافظ دست نیافتہ است. اما از دیگر سو بیدل نبوغی است کہ درصائب نیست. درمولوی نبوغی می توان سراغ کرد کہ درحافظ نیست.

و بہ ھر حال ھمہ موفقھا نابغہ نیستند وھمہ نابغہ ھا نیز موفق نیستند. اما اگر بخواھیم بہ لھجہ سپھری در این زمینہ نظری بدھیم باید بگویم کہ اگر جای ھر کدام ازعزیزان و بزرگان درادبیات فارسی خالی بود، دست ذوق واحساس تاریخی باخلاء وجودی آنھارا احساس می کرد وبی قرار وآشفتہ در پی چیزی می گشت."(۲۲)

منابع ومآخذ

۱۔ شیرازہ سہ ماھی، ج۱، شمارہ۱، جنوری۱۹۶۲م
۲۔ منظر اعظمی، اردو میں تمثیل نگاری، انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۹۲م، ص۳۶
۳۔ ھمان
۴۔ دیوندر اسر، ادب اور نفسیات، ص۷۱۔۷۲
۵۔ ھمان
۶۔ دکتر عبدالسلام، ادبی اشارے، ص۳۵
۷ منظر اعظمی، اردو میں تمثیل نگاری، ص۵۵
۸۔ Allegory of love, p. 44
۹۔ عبدالسلام سندیلوی، ادبی اشارے، ص۳۵
۱۰۔ Allegory of love, p. 61
۱۱۔ حسن حسینی، بیدل، سپھری وسبک ھندی، ص۱۸
۱۲۔ علی دشتی، نگاھی بہ صائب، ص۶۶
۱۳۔ کلیات اشعار استاد خلیل اللہ خلیلی، ص۹
۱۴۔ یحی آرین پور، از صبا تا نیما، ج۱، ص۹
۱۵۔ حسن حسینی، بیدل، سپھری وسبک ھندی، ص۹۹
۱۶۔ پروفسور بنی ھادی، عبدالقادر بیدل دھلوی، (ترجمہ دکتر توفیق سبحانی)، تھران، ۱۳۷۶
۱۷۔ علی دشتی، نگاھی بہ صائب، ص۱۷۶
۱۸۔ ھمان، ص۱۷۷
۱۹۔ عبدالقادر بیدل دھلوی، ص۱۴۵
۲۰۔ دیوان صائب، ص۱۷
۲۱۔ دیوان بیدل، ص۲۹
۲۲۔ علی دشتی، نگاھی بہ صائب، ص۱۴۲

☆☆☆

تازہ کتب ورسائل: تعارف

مضامین پروفیسر محمد افضل الدین اقبال، مرتب: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم، اشاعت: ۲۰۱۹ء مطابق ۱۴۴۰ھ۔

ڈاکٹر افضل الدین مرحوم (سابق صدر شعبہ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) کے نواسے، جنہوں نے افضل الدین اقبال صاحب کے مضامین مرتب کر کے، آں مرحوم کے قدر داروں کو ممنون احسان کیا ہے، مرحوم ومغفور بڑے اچھے ذوق کے مالک تھے، اوران کے مضامین یکجا مرتب ہوکر بہت سے اہلِ ذوق کو زیادہ فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔ سرِ ورق کی تصویر میں کتب خانہ سعیدیہ میں حیدرآباد میں آمد کے موقع پر جو یادگار تصویر لی گئی وہ اس سرِ ورق کی زینت ہے، اس تصویر میں جدید اور قدیم شرفائے حیدرآباد اور چند بچے بھی شامل ہیں، تصویر میں مولانا آزاد اور ڈاکٹر یوسف الدین کے بھائی مولوی شرف الدین علامہ نصیر الدین ہاشمی اور ڈاکٹر افضل الدین اقبال وغیرہ شامل ہیں، اور آخری سرِ ورق پر بھی ایک اچھی تصویر یعنی مسجد والا جاہی مدراس چنئی کے پس منظر میں قاضی بدرالدولہ کا مزار ہے۔ اندر کے صفحات میں بھی ایک تصویر میں فخر الدین علی احمد کے ساتھ یوسف الدین صاحب اور احمد اللہ قادری صاحب ہیں، یہ کتب خانہ سعیدیہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے کیٹیلاگ کے افتتاح کا موقع ہے، اسی صفحہ پر ان کی دوسری تصویر سعیدیہ کے موقع پر مولانا آزاد کے ساتھ کچھ دوسرے شرفائے حیدرآباد موجود ہیں۔

مضامین میں ابتدا میں تو جیسا کہ ذکر ہوا، مرتب کے قلم سے ''کچھ پروفیسر افضل الدین اقبال کے بارے میں'' کے عنوان سے ان کا ذکر خیر ہے، پھر مرحوم مصنف کے مندرجہ ذیل مضامین اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں: (۱) سر محمد اقبال مدراس میں (۲) قاضی بدرالدولہ (۳) مولانا آزاد حیدرآباد میں (۴) کتب خانہ سعیدیہ میں تصوف پر عربی فارسی ترکی مخطوطات؛ خاص کر مجدد الف ثانی اوران کے سلسلے سے متعلق مخطوطات (۵) امجد حیدرآبادی کا غیر مطبوعہ کلام، (۶) امجد حیدرآبادی کی شاعری (۷) اردو صحافت عہد آصف سابع میں (۸) کتب خانہ ویلور (۹) حضرت سید شاہ عبداللطیف نقوی قادری اوران کی علمی خدمات (۱۰) نظام اردو ٹرسٹ لائبریری میں اخبارات اور رسائل (۱۱) محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ حیدر میں اردو۔

☆☆☆

Khuda Bakhsh Library

Journal

No. 187-190 January – December 2017

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Reg. No. 33424/77
Issue : 187-190
Quarterly Journal

Subscription
Individuals ₹ 400/-
Institutions ₹ 500/-
Foreign Individuals 30$
Foreign Institutions 60$

Editor
Dr. Shayesta Bedar
Director

ख़ुदा बख़्श लाइब्रेरी जरनल

अंक 187–190 जनवरी–दिसम्बर 2017

Opinions expressed by contributors are not necessarily those of the editor.

Printed by Md. Jawaid Ashraf at Pakiza Offset, Shahganj, Patna & published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna-800 004.

CONTENTS
Journal No. 187-190

English/Hindi Section

▪ The Arabian Apostle	*by* Prof. Md. Habib	1
▪ *Jati Moolak Hindustani Samaj*	*by* Dr. Ramnarayan Singh	14

Urdu Section

▪ Editorial	-	v
▪ Rasheed Ahmad Siddiqi's Unpublished letters	*comp. by* Dr. Fardul Hasan	1
▪ Prof. Hasan Askari : the Historian, the Man	*by* Dr. Md. Anwarul Haq Tabassum	19
▪ Iqbal and Sufism	*by* Dr. Manzar Aijaz	35
▪ Waris Alvi	*by* Dr. Ghulam Shabbir Rana	51
▪ *Iqbal* as presented by Daya Narayen Nigam	*by* S. K.	63
▪ Syed's Scientific Society/ Aligarh Institute Gazette	*by* S.K.	145
▪ Sa'ib and Bedil	*by* Dr. Akhlaq Ahmad Aahan	205
▪ New Arrivals: Books/Periodicals	*by* Ed.	222

Our Contributors

- *Dr. Akhlaq Ahmad Aahan, Centre of Persian and Central Asian Studies, JNU, New Delhi-110076.*
- *Dr. Fardul Hasan, Iram Publishing House, Daryapur, Sabzi Bagh, Patna*
- *Dr. Ghulam Shabbir Rana,Mustafabad, Jhang City, Pakistan*
- *Dr. Manzar Aijaz, Formerly Professor of Urdu, Patliputra University, Patna*
- *Dr. Md. Anwarul Haq, Former Asso. Prof. Oriental College, Patna City, Patna*
- *Dr. Mohammad Habeeb (Late), Ex-Professor Department of History, AMU, Aligarh*
- *Dr. Ram Narayan, Deptt. Of Sociology, Patna University, Patna*

THE
ARABIAN APOSTLE

by
Prof. Mohammad Habeeb
ex. Professor of History AMU, Aligarh

On the Occasion of Birth Anniversary
of the The Prophet (PBUH)
Khuda Bakhsh Library Patna pays its homage
10 November 2019

Courtesy : Prof. ***Perwaiz Talib*** *of AMU, Aligarh*

1

DARK AS WAS THE CONDITION of the world in the sixth century of the Christian era, the light of morning was also near. The efforts of countless generations and a series of progressive revelations had at last prepared mankind for the final message. On the 9th of Rabiul Awwal[1] (20 April 571 A.D.) the Arabian Apostle was born at Mecca to herald in the last and the greatest revolution in the religious consciousness of mankind—a revolution based on the conception of human equality and brotherhood and the worship of the one and the unseen God, in which the teachings of Abraham and Moses and Christ were to find their rational consummation. The biographers of the Apostle declare in their symbolic language that fourteen towers of the Persian Emperor's palace fell down on that day while the fire of famous Zoroastrian temple was mysteriously put out, and the bed of the river Sawa dried up all of a sudden.[2] But what really fell was the power of the Magian priesthood, whose mysterious ceremonies and want of faith could no longer bolster up a tottering throne, and a formal and sect-ridden Christianity, which for several generations had deluged Asia Minor with blood; and with them, as the vivifying breeze of monotheism blew over the landscape, bringing peace and strength and joy to the hearts of men, there disappeared many horrid cults and degrading beliefs, which had been hanging over the minds of their votaries like a thick and pestilential fog. 'Islam'—resignation to the Divine Will and a superb, haughty contempt for the powers of evil—was the spirit of the new faith. Out of the embers of three decaying civilizations, there was fashioned a new social order of

1. Scholars have differed as to the date of the Apostle's birth, but it is agreed on all hands that the month was Rabiul Awwal and the day was a Monday and that the date was between the 9th and the 12th. Now the second Monday of Rabiul Awwal fell on the 9th, which must therefore be accepted as the date of the Apostle's birth. The question has been well discussed in a pamphlet by the Egyptian scholar, Mahmud Pasha Falaki.

2. This tradition is very popular, but, as the action has proved elsewhere, its authenticity is questionable.

terrific strength, with the hope of eternity throbbing in its bosom and the light of morning sparkling in its eyes.

In order to preserve the eloquence and the traditions of the desert, which they so highly prized, the nobles of the Arabian cities had established the custom of sending their children soon after their birth to be nursed by women of the Bedouin villages.[3] For two or three days after his birth the Apostle to whom the name Mohammed was given by his grand-father, Abdul Muttalib, was nursed by his mother and then by Sawibah, a slave-girl of Abu Lahab. Soon after a number of women from the tribe of Hawazan came to Mecca to procure some children of the aristocracy to nurse, and from amongst them, the Apostle was assigned to Halima Sa'diya. That lady was at first reluctant to accept an orphan boy but as she was unable to find any one else, she consented to keep him.[4] The young child found a congenial home in the family of his foster-mother and always retained the warmest affection for her and all her family. When Halima came to see him during the Apostle period, he ran up to embrace her with the words "My mother! My mother!" on his lips. His foster-father, Haris, also came to see him. "What is this you preach?" he asked. "The day will come", the Apostle replied, "when I will prove to you the truth of my assertions!" Halima[5] and Haris joined the new faith with their son Abdullah and their daughter Hazaqah, generally known as Shima, but unfortunately nothing is known of the Apostle's two remaining foster-sisters, 'Anisah and Hazaqah. After he had been with her for two years, Halima brought the Apostle to Mecca, but as a plague was raging there, Amina asked her to take him back again. At the age of six he was finally returned to his mother.[6] Judging from the Apostle's later opinion, the experi-

3. Even after the Umayyad dynasty had been established at Damascus, the custom continued and princes of the royal house were assigned to Bedouin women to be brought up in the atmosphere of the desert.

4. Sahl declared that the profession of a paid nurse was not considered respectable and Halima's family only undertook it owing to a severe famine that year. But such aristocratic ideas must have been confined to the noble families of the cities because we regularly hear of Bedouin women coming to the cities every year to procure children from the rich families.

5. Ibn-i Kasir says that Halima died before the Apostle's era, but this is incorrect. The fact of her conversion is stated in the *Tarikh-i Ibn-i Khaldun*, the *Tarikh-i Ibn-i Jarir* and the *Mukhtasar Sirat Abi Dawd* of Mazzi. Hafiz Mughlatai wrote a special treatise on the subject (*Zarqani*, Vol. I p. 170). For the conversion of Haris, see *Asabah fi Ahwal-i Sahabah*, published by the Matbai Sa'adat, Egypt, Vol. I. p. 292.

6. There is difference of opinion as to the Apostle's age at the time. Ibn Yunus gives it as six years.

ment had proved a success. "I am more eloquent than others", he used to say, "because I combine the blood of the Quraish with the dialect of the Hawazin."[7]

In the same year, it would seem, Amina took her son to Medina on a visit to her husband's tomb,[8] but during her return journey after a month she died at Abwaia and the Apostle was brought back to Mecca by a woman-servant, Ummi Aimen. Young though he was, the Apostle remembered many incidents of this short sojourn at the scene of his future activities. "This is the house in which my mother stayed", he remarked to his companions once when they were passing through the settlement of Banu Adi, "In this pond I learnt swimming and here, on this plain, I used to play about with a girl, named Anisah." His grand-father, Abdul Muttalib, became his guardian after his mother's death, but two years later Abdul Muttalib also died at the patriarchal age of eighty-two, and his weeping grandson accompanied the funeral procession to the grave.[9] The sad event suddenly changed the balance of influence and power in favour of the Umayyads, whose leader, Harb, succeeded to Abdul Muttalib's position, excepting, the office of *Saqqah* (giving water to pilgrims), held by the Apostle's youngest uncle, Abbas, no other dignity remained in the hands of the Hashimites.

Of the ten sons of Abdul Muttalib, Abu Talib and Abdullah were children of the same mother, and Abdul Muttalib before his death had assigned the Apostle to Abu Talib's care. The latter looked after the son of his deceased brother with an affection and tenderness that left nothing to be desired and loved him more than his own sons. The young boy wandered about the desert looking after his uncle's goats and eating berries with a freedom and happiness he loved to recall in later life. When he had reached the age of twelve, Abu Talib started for one of his trading journeys to Syria. He was reluctant to take his nephew with him on such an arduous venture, but

7. *Tabaqat* Ibn Sa'd, Vol. I, p. 71.

8. This appears to have been the real object of the journey. Abdul Muttalib's mother belonged to the Najar tribe of Medina, but this distant relation could hardly have induced Amina to undertake such a long journey.

9. Abdul Muttalib was buried at Hajun. Dr. Margoliouth, (Muhammad), pp. 45 to 48 accuses Abdul Muttalib of not keeping his grandson well. The statement is based on a tradition of Bukhari. In days when wine was still permitted to Muslims Abbas killed a camel belonging to Ali in a fit of drunkenness and fried its brain on fire and when the Apostle went to protest against the act, Abbas retaliated by saying "My brother's child". But words spoken in anger and intoxication can hardly be considered as scientific evidence.

the latter clung to him and would not be denied. Abu Talib had to yield. On reaching Basra, uncle and nephew lodged with a Christian monk, named Bahira, an incident which has drawn the attention of Christian as well as Muslim writers. 'This is the leader of the Apostles, the monk is said to have remarked as soon as he saw Abu Talib's nephew. "Why?", the monk stated that he had actually seen the trees and stones bow to the Apostle as he descended down the hill. The story, however, rests on a tradition the authority of which is very questionable.[10]

Some time after the Apostle's return, the 'sacrilegious war'[11] broke out between the tribes of Quraish and Qais. Both tribes assembled all their families but the Quraish led by Harb defeated their opponents. The Apostle was present on the field by the side of his family and kindred, but he refrained from raising his hands against the enemy. "Apart from the fact", Imam Suhaili remarks, "that the war was waged in the sacred months, the strife was one between heathens and heathens and a Mussalman is not allowed to fight except for the glory of Allah." The war was followed by a pact, known as the *Halaful Fuzul*[12] by which the leaders of the Quraish swore to defend the helpless and to exclude tyrants from Mecca. Nothing came of the pact, but the Apostle who was one of the signatories,

10. Sir William Muir, Draper, Margoliouth and other Oriental writers look on the Bahira incident as a compliment to Christianity and would have us believe that the teachings of Bahira were the real source of Islam. But apart from the impossibility of initiating a boy of twelve into all mysteries of faith, the tradition, if it is to be accepted at all, must be accepted in the form in which it has come down to us. It says nothing about Bahira instructing the Apostle in anything whatsoever.

The tradition itself is declared by Tirmizi to be "weak and improbable" (Hasan ug gharib). One of its narrators, Abdur Rahman bin Ghazwan, is declared by some eminent scholars to be unacceptable. "Abdur Rahman often narrates incorrect traditions", Zahabi says in the *Mizanul Itidal*, "and the most incorrect of them is the story of Bahira." The same critic after quoting Hakim's statement that the Bahira tradition comes up to the standard of evidence required by Muslim and Bukhari declares that in his opinion several parts of the Bahira story are manufactured lies (*Takhrid Mustadrak*). See also *Asabah* by Abdur Rahman bin Ghazwan. Bilal and Abu Bakr are said to have accompanied the Apostle, but Abu Bakr was very young then and Bilal was altogether non-existent; on this ground Shah Ibn-i Hajar considers some parts of the tradition unacceptable and declares that Abdur Rahman bin Ghazwan was often guilty of error. Lastly, the chain of narration is altogether incomplete and we are nowhere told as to the contemporary eye-witness on whose authority the tradition is based. It must be, therefore, rejected.

11. Because waged in the sacred months.

12. So named after its first signatories. *Tabiqat*, Vol. I, p. 82.

often declared in later life that he would have preferred it to 'red camels.'

He was soon called upon to render a more distinguished service. The sacred building of the Ka'ba was then a mere enclosure and the wall surrounding it was not more than a man's height. Moreover as it was situated in a depression, the rainwater of the city flowed into it and a dam, that had been constructed to keep it off, often broke down owing to the impetuosity of the torrent. It was, therefore, decided to pull down the building and construct it again on stronger foundations. Walid bin Mughira purchased on behalf of the Quraish the planks of a merchant-ship that had foundered off the coast of Jeddah and brought it to Mecca with a Roman mason, Baguen. The parts of the sacred building were apportioned between various families and the work went on amicably enough till the question, who was to lay the sacred black stone, nearly led to bloodshed. Everyone was anxious to have the honour for himself. For four days a bitter strife raged and some of the claimants with characteristic Arab impetuosity dipped their hands in cup of blood to signify their resolution to win or die. On the fifth day Umaitha bin Mughira, the oldest of the Quraish, suggested a compromise. They were to accept as their arbiter the man who first entered the holy ground next. This was agreed upon and as a happy chance would have it, the person who came first was the Apostle himself. He performed his delicate duty to the satisfaction of all parties. After placing the stone in the centre of a sheet, he asked Quraish chiefs to catch hold of the corners, and after it had been raised to the required height, he placed it in the wall with his own hands. It was a symbolic act: "I am the last stone of the Apostolic edifice." The sacred building was completed and roofed.[13]

For centuries before the rise of Islam the Arabs had been a nation of traders. The Apostle's uncle, Abu Talib, was a merchant and he also took to the same profession when he attained the age of discretion and wanted a means of livelihood. He was clear, honest, straight-forward and soon won the good-will of those who had to

13. For want of sufficient building material, the new building did not cover the whole of the old enclosure, and a part of it was perforce left out. This is now known as Hatim. A wall was drawn round it to mark its outline and after the entry into Mecca the Apostle wished to pull down the building and construct it afresh so as to cover the whole of the old sacred ground. But he refrained from doing so lest the feelings of the new converts should be disturbed. For the facts of the above paragraph, see Ibn Hisham, Tabari, and Zarqani, Vol. I, pp. 252-40 and Bukhari.

deal with him. They felt they could rely on his word and deed, and loved to call him the 'honest merchant'. Abdullah bin Abil Hamsa, one of the Apostle's companions in days to come, relates a curious incident: "I was making some business arrangement with the Apostle when I took leave and promised to return immediately. But somehow the promise slipped out of my mind, and when on recollecting it after three days I hurried to the spot, the Apostle was still standing there. 'You have put me to much inconvenience', he said without the slightest indication of displeasure on his brow, 'I have been waiting for you here all this time!'"[14] In those days persons who could not themselves cart their stock from market to market generally entrusted their belongings to professional traders and paid the latter a part of the profit in compensation for their pains. Such a partnership with the Apostle was eagerly sought, for he was absolutely clean in his business dealings and scrupulously considerate of the rights and claims of others. Trading meant travelling and Apostle saw a good deal of the Arabian world in the course of his journeys.[15] Apart from Syria, which he had visited with his uncle, it has been proved that he twice visited Jash in Yemen; and when, during the Apostolic period the ambassadors of Bahrain came to see him, he told them that he had travelled extensively in their country.[16]

When he was about twenty-five, the Apostle's business dealings brought him into touch with a distant cousin[17] of his, a widowed lady of forty, named Khadija. She was so rich that when the caravans marched out of Mecca, her stock alone was more than that of all the rest. She had two sons and a daughter by two previous husbands, and her chaste life had won for her the nickname of 'Tahira' or the Pure. Attracted by the Apostle's honest and straightforward character, she commissioned him to take her goods to Basra and promised to pay him a higher share of the profits than he got from others. Three months after his return, she sent him a proposal of marriage. Though Khadija's father was dead, her uncle was still alive, but with an Arab woman's innate love for freedom, she pro-

14. *Sunan-i Abi Daud*, Vol. II, p. 239.

15. The Apostle may have seen the Persian Gulf at Bahrain and the Red Sea in his journey, but no value, in my opinion, can be attached to Dr. Margoliouth's conjecture that he must have been on a sea-voyage because the descriptions of sea and storm in Quran have the vividness of a personal experience. Neither does the evidence before us prove that he ever visited Egypt.

16. *Musnad Imam Hanbal*, p. 208.

17. The Apostle and Khadija had the same ancestor in the 5th generation.

ferred to settle the matter on her own initiative.[18] The Apostle having consented to the proposal, the nobles of the Quraish assembled at Khadija's house on the appointed day and Abu Talib recited the marriage sermon. The *mahr* (marriage settlement) was fixed at five hundred *dirhams* of gold. The union proved to be a very happy one.[19]

Among the Arabs idol worship was the order of the day, and the monotheism of Abraham had been almost forgotten. "The gods were many. They were the patrons of septs and tribes, and symbolized, so to speak, the holy unity which united the present and past members of these. Above them all stood Allah, the highest and universal God. By Him the holiest oaths were sworn; in His name treaties and covenants were sealed; the lower gods were not fit to be invoked in such cases as they belonged to one party instead of standing over both. But since Allah ruled over all and imposed duties on all, it was not thought that one could enter into special relations with Him. In worship He had the last place, those gods being preferred who represented the interest of a specific circle, and fulfilled the private desires of their worshippers. Neither the fear of Allah nor reverence for the gods had much influence. The disposition of the heathen Arabs, if it is at all truly reflected in their poetry, was profane to an unusual degree. Their motives to noble deeds are honour and family feelings, they hardly name the gods, much less feel any need of them. There is nothing mystical in these hard, clear and yet so passionate natures."[20] Three hundred and sixty idols had been placed in the Ka'ba, and the Quraish, who prided themselves in being its guardians, placed before the pilgrims the option of dressing like the Quraish or remaining nude while going round the Ka'ba. Most of the pilgrims, we are told, preferred the alternative, and the holy ceremony was performed in a condition of nudeness.

Even before the advent of the Apostle there were minds thoughtful enough to revolt against this senseless heathenism. Of these

18. It is stated by some traditionists that Khadija's father was drunk at the time of her marriage but protested against the inequality of the marriage when his sobriety returned. This is, however, incorrect and Suhali has conclusively proved that Khadija's father had died before the Holy War.

19. The facts appertaining to the Apostle's marriage will be found with more or less detail in Ibn Hishamm, Ibn-i Sa'd and Tabari. For an exhaustive treatment see Zaidan, Vol. I, pp. 232-236. I have selected from those accounts the traditions that appeared to me most certain.

20. Wellhausen, *Encyclopaedia Britannica* ("Mohammedanism").

dissenters Ubaidullah bin Jahsh, Warqa bin Naufal, Usman bin al Hawarts and Zaid bin Amr bin Nafil are best known. Warqa and Usman accepted Christianity, while Zaid died with a pathetic regret on his lips: "O Lord! I would have worshipped Thee in the true form, had I but known it." The Apostle is known to have met Zaid some time or other.[21] Warqa was his wife's cousin, and, according to one tradition, an intimate friend also. He is also said to have been present at a sermon of Qas bin Sa'dah al Aiaz, but this is doubtful.[22]

21. Bukhari.

22. Qus's sermon has been quoted by many works on literature and as it consists of short and rhyming sentences, European critics have imagined it to be the model of the Quran. The tradition will also be found in various forms in Baghwi, Aadi, Baihaqi, Ja'ir, etc. but it is purely an invention and most of its narrators are not only unreliable but downright liars. The question has been discussed by Suyuti in his Muzaha'at as well as the Aluma Zahabi, Hafiz Ibn Hajar and others. Though the tradition is traced through various series of narrators, who are credited with inventing false traditions, Mu'ammad Ibn Hajjaj, a narrator common to many series, is declared by Ibn-i Mu'in to be a 'liar' and a 'liar' while Ibn-i 'Adi credits him with inventing the false traditions of Hariat. Concerning Said bin Habira, who is responsible for another series, Ibn-i Hibban states that "he attributed false to truthful people and either invented false traditions or else got other people to invent them for him". Qasim bin Abdullah and Ahmad bin Sa'id, who are responsible for another series, are notorious for their false tradition. Baihaqi quotes a long story about the traditions in which Abu Bakr quotes the whole sermon of Qas bin Sa'dah from memory. But, as Hafiz Ibn-i Hajar has proved, it is a pure invention. For a further discussion, see *Tafsiul Laqlial Maqa'ib*, printed in Qatar, pp. 95-100.

In the time of the Umayyad and Abbasid caliphs a curious custom had been evolved. Contemporary men of letters were asked to compose sermons and verses, which were incontinently attributed to pre-Islamic or early Muslim heroes. Muhammad bin Ishaq Ibn Yasar, whom Imam Bukhari considered to be reliable enough for a tradition to stand Cross-off, was in the habit of asking contemporary poets to write verses on the Apostle's wars which he later on included in his work (Allama Zahabi, *Mizanul Itidal*, p. 92). Ibn-i Hisham has attributed hundreds of verses to Khadija, Abu Talib, Abu Bakr and others the language of which clearly shows them to be later fabrications, and even Ibn-i Hisham often confesses that "many literary critics consider them to be spurious". The obvious motive was a glorification of Islam, either the advent of the Apostle was heralded or it was attempted to supply evidence for some event of his life. Thus the sermon of Qas bin Sa'dah contains the lines: "Welcome to the Apostle, whose advent is near. He shall lead aright those who follow him and those who resist and oppose him shall be doomed to perdition." Often the Quran itself was taken as a model by these later-day compositions. Professor Margoliouth himself testified to this fact (Mohammad, pp. 27-28). A comparative study of the changes the Arabic language has undergone will aptly enable the critic to discern the time of their composition, but it is curious to find that European writers should have mistaken these spurious verses of the Umayyad and the Abbasid period for the pre-Islamic compositions in imitation of which they pretend the Quran was composed.

The Apostle's own attitude towards idolatry was one of uncompromising negations throughout. Even in his childhood he congratulates himself on the good fortune that an accident had prevented him from joining a meeting where old stories were related. He refused to eat the flesh of animals sacrificed to idols and tried to induce his personal friends to refrain from worshipping them. A neighbour once heard a conversation between him and his wife. "By Allah, Khadija", the Apostle was saying, "I will never worship Lat or 'Uzza." "Well, then", Khadija replied, "cast aside Lat and cast aside 'Uzza." It speaks much for the happiness of his married life that his wife should have been his first convert.[23] His personal friends of those days were remarkable for the purity of their lives. The chief of them, Abu Bakr, occupies a unique position in the history of Islam. The Apostle was also on intimate terms with Khadija's cousin, Hakim bin Hizam, one of the greatest Quraish nobles and the proprietor of the *Darun Nadwa*. Hizam was not converted to Islam till the eighth year of the Flight, but religious differences did not interfere with his affection for the Apostle. He once presented himself at Medina with a cloak worth fifty gold pieces, which he had purchased as a present for the Apostle. "I cannot accept a present

23. Mustad Imam Hanbal. Vol. IV, p. 23. Lat and 'Uzza were idols of the Quraish. 24. Margoliouth's assertion that the Apostle used to worship Lat and 'Uzza before going to bed is based on a hopelessly incorrect and inconsistent interpretation of the text of this tradition. The statement that they (the Quraish) used to worship (Kana) idols is wrongly attributed to the Apostle. The same writer also declares that the Apostle sacrificed a goat to 'Uzza but quotes no authority for it except Wellhausen. There is a statement to this effect in Mujamul Buldan a treatise on geography but apart from the fact that such a work can lay no claim to being an authority on tradition, the particular story is due to the invention of Kalbi, a notorious liar. Christian writers, who wish to prove that the Apostle conformed to the practices of idolatry, are fond of referring to a tradition in the Tarikh-i Sagir that the Apostle had a son, named Abdul 'Uzza (servant of 'Uzza). Even if the tradition was correct, it would prove nothing more than that Khadija, who worshipped idols before her conversion, gave this name to her son and the Apostle merely tolerated it. But the tradition is not correct, and it would be interesting to quote the opinion of the leading traditionists about Ismail bin Abi Owais, the first narrator on whose authority it is based. Mu'awiyah bin Salih: "Ismail and his father are both unreliable." Yahya bin Makidah: "He (Ismail) is a liar and quite worthless." Imam Nasai: "He is weak and unreliable." Nasr bin Salma Marozi: "He is a liar." Warqani: "I do not believe in Ismail's authority for a correct tradition." Saff bin Muhammad: "He manufactures false traditions." Salma bin Shab: "He has himself confessed to me that whenever there is a difference of opinion he invents a tradition on his own account." The authorities before us state with the utmost clarity that far from himself taking part in the practices of prevailing heathenism, the Apostle tried to induce his intimate friends to keep aloof from it.

from an idolator", the latter replied, "but I shall take it if you will consent to accept the price." Hizam had perforce to take the money. In his later years Hizam sold the Darun Nadva to Amir Mu'aviya for a hundred thousand *dirhams* and distributed the money in charity.[24] Another member of the circle was Zamad bin Sa'lab, a physician. Tradition records that on returning to Mecca after a long absence, Zamad saw the Apostle in a street followed by a mob of hooting children. As his enemies had spread the rumour that the Apostle was mad, Zamad approached him with the assurance: "Mohammed! I can cure people of insanity!" The latter, however, replied in brief and trenchant words which converted Zamad to Islam on the spot.[25]

Happily married to a lady of considerable wealth, and immersed, to outward view, in business affairs which often entailed long journeys, the Apostle's inner thoughts were concentrated on questions far different from those of barter and sale. "This deep-hearted son of the Wilderness, with his beaming black eyes and open social deep soul", Carlyle says, "has other thoughts in him than ambition. A silent, great soul; he was one of those who cannot but be in earnest; whom Nature herself has appointed to be sincere. While others walked in formulas and hearsays, contented enough to dwell there, this man could not screw himself in formulas; he was alone with his own soul and the reality of things. The great Mystery of Existence, as I said, glared in upon him, with its terrors, with its splendours, no hearsays could hide that unspeakable fact, 'Here am I.' Such *sincerity*, as we named it, has in very truth something of divine. The word of such a man is a Voice direct from Nature's own Heart. Men do and must listen to that as to nothing else—all else is wind in comparison. From of old, a thousand thoughts in his pilgrimages and wanderings, had been in this man: What am I? What is the unfathomable thing I live in, which men name Universe? What is life; what is Death? What am I to believe? What am I to do? The grim rocks of Mount Hara, of Mount Sinai, the stern sandy solitudes answered not. The great Heaven rolling silent overhead, with its blue glancing stars, answered not. There was no answer. The man's own soul, and what of God's inspiration dwelt therein had to answer! . . . The jargon of argumentative Greek Sects, vague traditions of Jews, the stupid routine of Arab Idolatry: there was no answer in these . . . Use and wont, respectable hearsay, respectable formula: all these are good or are not good. There is something behind and beyond all these, which all these must correspond with, or be the image of, or they are—*Idolatries*; bits of black wood pretending to be God; to the earnest soul a mockery and

24. Asaban, Hisam; *Nuzat Tarea Rauhai*, Vol. III, p. 465.
25. Ibnab and Asabah.

abomination. Idolatries never so gilded, waited on by the heads of the Koreish, will do nothing for this man. Though all men walk by them, what good is it? The great Reality stands glaring there upon him. He there has to answer it, or perish miserably. Now, even now, or else through all eternity never. Answer it; thou must find an answer—Ambition. What could all Arabia do for this man; with the crown of Greek Heraclius, of Persian Chosroes, and all crowns in the Earth—what could they all do for him? It was not of the Earth he wanted to hear tell; it was of the Heaven above and the Earth beneath...'*

Three miles from Mecca was a cave known as Hira, the declivities of a mount of the same name. Thither the Apostle often retired for weeks and months together, and only came home to take back a fresh supply of provisions. What was his 'prayer' in these long and lonely sojourns? 'Meditation and thoughtfulness', says the commentary on Bukhari, but perhaps the real movement of the Apostle's thought was not unlike the arguments of the Apostle's thought that had convinced Abraham in days of old.

"And thus did we show Abraham the Kingdom of heaven and earth, so that he may be among the faithful.

"When the darkness of night enveloped him, he saw a star, 'Is this my Lord?' he asked. But when it had set, he remarked: 'I do not like the setting ones.'

"Next when the moon arose, he asked: 'Is this my Lord?' but when it had set, he again remarked, 'If my Lord had not led me right, I should have been among the erring people.'

"Lastly, he saw the sun rising and asked: 'Is this my Lord? Is this the greatest?' But when it had also set, he declared: 'O people! I will not bow to those you set up (with Allah). I have turned myself exclusively to Him who has originated the heavens and the earth, and I am not among the polytheists.'

"And his people disputed with him. 'Do you dispute with me about Allah, who has guided me on the right path', he answered, 'I fear nothing from those (gods) you set up besides Allah, unless it pleases my Lord. All things are comprehended in His knowledge. Why do not think of it?'" (The Quran, chapter VI, 9).

They were years of silent and thoughtful preparation for his destined mission in life. He had been musing, reflecting and meditating constantly but it was not till the age of forty that the first revelation was vouchsafed to him.

(This article appeared in Jubilee Number of the *Aligarh Magazine*, 1935—Editor)

***

*Dr. Hooper, *Hero-Worship and the Heroic in History*, Oxford University Press, 1912, pp. 54-55 (Editor)

जातिमूलक भारतीय समाज परिवर्तन की दशा और दिशाएँ

डॉ.रामनारायण सिंह

अन्तर्राष्ट्रीय स्तर पर मानवशास्त्रियों एवं समाजशास्त्रियों ने भारतीय सामाजिक परिवर्तन की प्रक्रिया पर एक लम्बे समय तक बहस किया है। भारतीय समाज ने बिद्वानों का ध्यान इसीलिए विशेष रूप से आकृष्ट किया है कि यहाँ का समाज जाति व्यवस्था पर आधारित है, जिसके चलते सामाजिक गतिशीलता बाधित होती रही है। अमरीकी मानवशास्त्री बेरमेन तथा समाजशास्त्री जॉनसन ने भारतीय समाज को बन्द समाज के एक चरम उदाहरण के रूप में ही लिया है, क्योंकि जाति व्यवस्था के अंतर्गत व्यक्ति को आजीवन एक ही सामाजिक स्थिति में रहना पड़ता है। अगले जन्म में ही उसकी जातिगत सामाजिक स्थिति में परिवर्तन की संभावना हो सकती है। भारत की तुलना अमरीकी समाज से करते हुए उन्होंने बताया है कि दोनों देश सामाजिक गतिशीलता के स्तर पर वैचारिक विरोधी है।

भारत एक तरफ जाति व्यवस्था पर आधारित बन्द व्यवस्था है तो अमरीकी समाज वर्ग व्यवस्था पर आधारित एक खुला समाज है। दूसरे शब्दों में जाति व्यवस्था पर आधारित समाज बन्द समाज का उदाहरण है, जबकि वर्ग पर आधारित समाज खुले समाज का उदाहरण है। आगे भी जॉनसन ने बताया है कि बन्द एवं मुक्त समाज की अवधारणा एक सैद्धान्तिक द्विधुवीय विभाजन है, इसलिए कि न तो भारतीय समाज पूरी तरह बंद समाज है और नहीं अमरीकी समाज पूरी तरह खुला समाज है।

बन्द समाज की कुछ विशेषताएँ अमरीकी समाज में देखने को मिलती हैं, तो खुले समाज की कुछ विशेषताएँ अमरीकी समाज में भी देखने को मिलती हैं।

कुछ विद्वानों ने मध्यकालीन यूरोपीय समाज को भारतीय समाज और वर्तमान पाश्चात्य पूँजीवादी समाज के बीच रखा है। उन्होंने बताया है कि मध्यकालीन यूरोप एक सामन्ती व्यवस्था पर आधारित समाज था और वह समाज मुख्य रूप से तीन वर्गों में विभाजित था – (1) पादरी वर्ग, (2) कुलीन वर्ग एवं (3) तृतीय इस्टेट। व्यापारी मजदूर, किसान ये सभी तृतीय इस्टेट में आते थे। इन तीनों वर्गों के बीच सामाजिक गतिशीलता वर्तमान समय की तुलना में बहुत कम थी, पर प्राचीन एवं मध्यकालीन भारत की तुलना में बहुत ज्यादा।

प्राचीन काल में भारतीय समाज जब वर्ण व्यवस्था पर आधारित था तो निश्चित रूप से उस समाज में ज्यादा खुलापन था। इतिहासकार यह दलील देते है कि पूर्व वैदिक काल में योग्यता एवं गुणों के आधार पर व्यक्तियों के वर्ण में परिवर्तन होता था। समाज के विभिन्न स्तरों के बीच सामाजिक बँटवारे में कठोरता नहीं पायी जाती थी। बहुतों के मन में यह प्रश्न उठ सकता है कि क्या वर्ण व्यवस्था पर आधारित भारतीय समाज सामन्ती व्यवस्था पर आधारित मध्यकालीन यूरोपीय समाज की तरह था ? इसका हाँ या ना में जवाब देना कठिन है। नकारात्मक एवं सकारत्मक दोनों जवाब विवाद के घेरे में हैं, क्योंकि प्राप्त सबूतों के आधार पर अंतिम रूप से कहना किसी भी व्यक्ति के लिए जोखिम भरा काम है। इतिहासकार चाहे जो भी दलील दें, समाजशास्त्री उसे उतनी आसानी से स्वीकार करने के लिए तैयार नहीं हैं।

उत्तर वैदिक काल से लेकर लगभग 19वीं सदी के पूर्वार्द्ध तक भारतीय समाज को बन्द समाज का एक सबसे सटीक उदाहरण माना जा सकता है। इस लम्बे कालखंड में समाज जाति व्यवस्था के नियमों से इतना ज्यादा ग्रासित था कि सामाजिक गतिशीलता अधिकांश लोगों के जीवन में एक दिवास्वप्न जैसी थी। निम्न जाति में पैदा होकर कोई व्यक्ति ऊँची जाति की सामाजिक हैसियत और सम्मान को नहीं पा सकता था। भारत एक अजीबोगरीब देश रहा है जहाँ छूआछूत की जबर्दस्त भावना के कारण आदमी से आदमी अपवित्र होता था। आज भी यह कहीं–कहीं देखने को मिल ही जाता है। हर किसी को ज्ञान अर्जन, पूजा–अर्चना, सामाजिक सहवास एवं साथ में खाने–पीने का समान अवसर प्राप्त नहीं रहा है। लोग अपनी ही जाति में विवाह करते थे और आज भी हिन्दू समाज में जाति पर आधारित विवाह का प्रचलन है। सदियों से समाज हजारों जातियों–उपजातियों में विभक्त रहा है, वर्तमान सामाजिक हैसियत को पूर्वजन्म का पाप माना जाता रहा है। लाख चाहकर भी कोई व्यक्ति पूर्वजन्म के पाप से इस जन्म में छुटकारा नही पा सकता था। जातीय नियमों का उल्लंधन का इतना बोलबाला था कि शायद ही कोई व्यक्ति अपने हिन्दू धर्म या जीवन–दर्शन को चुनौती देने की बात सोच सकता था। समाजशास्त्रियों का मानना है कि इस ढंग का समाज विश्व के किसी भी कोने में और किसी भी काल में नहीं पाया जाता था। इसीलिए भारतीय समाज को आखिरीतौर पर बन्द समाज का दर्जा दिया जाता है।

भारतीय समाज में जड़ता का कारण मात्र ब्राह्मणवादी हिन्दू दर्शन ही नहीं हैं बल्कि दकियानूस इस्लामी समाज के साथ संसर्ग भी है। मुस्लिम शासनकाल में भारतीय समाज में जड़ता

को काफी बढ़ावा मिला और समय के साथ सामाजिक स्तरण में कठोरता आई। यह सही है कि इस्लामी समाज समानता पर आधारित है तथा अल्लाह की नज़रों में हरेक इंसान बराबर है, लेकिन इस्लाम के मानने वालों का अपने और गैर–मजहबों के प्रति ऐसा ख्याल और व्यवहार रहा है कि प्रतिक्रिया स्वरूप हिन्दू समाज में काफी जड़ता आ गयी। इसका एक असर यह हुआ कि भारतीय मुस्लिम समाज भी जातिगत स्तरण से अछूत नहीं रह पाया। समय के साथ वहाँ भी बहुत जातियों एवं उपजातियों ने जड़े जमायीं और इस्लाम धर्म के मूलयों के विपरीत वहाँ भी बन्द समाज की विशेषताएँ परिलक्षित होने लगी। यही कारण है कि भारत का इस्लामी समाज विश्व के अन्य मुस्लिम समाज से काफी भिन्न है। सैद्धान्तिक रूप से इस्लामी समाज काफी बराबरी वाला समाज है, लेकिन व्यावहारिक रूप से लगभग हिन्दूओं की तरह ही वह एक बन्द समाज है। भारतीय जाति व्यवस्था का प्रभाव सिर्फ इस्लामी समाज पर ही नहीं पड़ा बल्कि अन्य धर्मों के अनुयायियों के बीच भी यह देखने को मिला है। ईसाई धर्म मानने वाले भी जात–पात की भावना से बहुत ऊपर नहीं उठ पाए हैं। चूंकि गैर–हिन्दू धर्म की आबादी के विस्तार का एक प्रमुख आधार धर्म–परिवर्तन रहा है, इसीलिए हिन्दू धर्म को मानने वाले लोग अपने साथ–साथ दूसरे धर्मों में भी जाति व्यवस्था लेते गए। धर्म तो बदल गया, लेकिन जाति उनके साथ रह गयी।

योगेन्द्र सिंह ने एम.एन.श्रीनिवास के इस बात का खंडन किया है कि अंग्रेजों के आने के पूर्व भारतीय समाज एक स्थिर समाज था। अपनी दलील के समर्थन में योगेन्द्र सिंह ने कुछ समाज वैज्ञानिकों के अध्ययनों का हवाला दिया है। लेकिन, उन विद्वानों के द्वारा किये गये अध्ययनों से यह पता चलता है कि

उन लोगों ने सामाजिक गतिशीलता की छिटपुट घटनाओं को लेकर यह साबित करने का प्रयास किया है कि प्राचीन एवं मध्यकालीन युग में भी सामाजिक गतिशीलता थोड़ी–बहुत पायी जाती थी। किन्तु इन छिटपुट घटनाओं के आधार पर समस्त भारतीय समाज के बारे में यह नहीं कहा जाना चाहिए कि भारतीय समाज में वर्तमान समय की तरह ही सामाजिक गतिशीलता कभी मौजूद थी। अपने तर्क के समर्थन में आगे योगेन्द्र सिंह ने इतिहासकार पणिक्कर की इस बात का भी हवाला दिया है कि महापद्म नन्द के बाद भारत में ऐसे कई महान राजा हुए जो गैर–क्षत्रिय थे। कुछ निम्न जाति के लोगों के द्वारा राज्य हासिल कर लेने मात्र से हरेक निम्न जाति के लोगों के जीवन में सामाजिक गतिशीलता की स्थिति उत्पन्न हो गयी, इसे स्वीकार नहीं किया जा सकता है। पूर्व की तरह आज भी बहुत–सी पिछड़ी जातियाँ अपने आपको ब्राह्मण या क्षत्रिय होने का दावा पेश करती हैं। यदि समाज में नीचे से ऊपर चढ़ना इतना आसान होता तो आज ब्राह्मण और राजपूतों की संख्या देश में सबसे अधिक होती। 1931 तक की जनगणना रपट में जो जाति सम्बन्धी आँकड़े मौजूद हैं उन्हें देखने से यह स्पष्ट होता है कि भारत की पूरी आबादी में ब्राह्मणों और राजपूतों का हिस्सा आज भी 10 प्रतिशत से कम है।

यदि सामाजिक गतिशीलता व्यापक स्तर पर चलती, तो संभव था कि अधिकांश हिन्दू अबतक ब्राह्मण और राजपूत बन गये होते क्योंकि प्राचीन काल से लेकर आज तक लगभग सभी निम्न जाति के लोगों ने इन दो वर्णों एवं जातियों के सामाजिक स्थिति को प्राप्त करने की भरपूर चेष्ठा की है। इतिहास में जो भी सामाजिक गतिशीलता की छोटी–मोटी घटनाएँ घटी हैं उन्हें

समाज के सभी लोगों ने कभी सहर्ष नहीं स्वीकार किया। बल्कि , यर्थाथ यह है कि जो दलित या निम्न जाति के लोग राजगद्दी हासिल करने में सफल हुए उनको ब्राह्मणों ने लोभवश या डरकर क्षत्रिय घोषित कर दिया या कुछ लोगों ने उच्च सामाजिक पद पाने के उद्देश्य से अपने आपको ब्राह्मण के द्वारा क्षत्रिय घोषित करवा दिया। इसके साथ–साथ कुछ इतिहास एवं साहित्य के पन्नों में ऐसा भी देखने को मिलता है कि ऊँची जाति के कुछ लोगों ने अपने आपको समाज में श्रेष्ठ साबित करने के लिए निम्न जाति के राजाओं को ब्राह्मण, क्षत्रिय या राजपूत के रूप में स्वीकार किया। वर्तमान समय में इस गलत प्रचार में सिनेमा एवं टी.वी. सीलिरयल की भी प्रमुख भूमिका रही है। इतिहासकार के. एम. पणिक्कर की मान्यता है कि ''इतिहास के पिछले दो हजार वर्षों में क्षत्रिय–जैसी कोई जाति ही नहीं हुई। नन्दवंशीय राजा ही अंतिम 'सच्चे' क्षत्रिय थे, और वे ईसा पूर्व पाँचवी शताब्दी में ही समाप्त हो गए। तब से प्रत्येक ज्ञात राजपरिवार किसी–न–किसी गैर क्षत्रिय जाति से आये हैं, जिसमें मध्ययुगीन भारत के प्रसिद्ध राजवंश भी शामिल हैं। पणिक्कर का यह भी कहना है कि ''ऐसा लगता है कि काफी हाल के युग में भी शूर्दों ने बड़ी भारी संख्या में राजपरिवार पैदा किए हैं। बंगाल के पाल तो निस्सन्देह ऐसी ही जाति के थे। महान मराठा राजवंश का कार्य आज चाहे जो भी हो, वह राजपूत वंश से उद्भूत होने के अपने वंशावलीय दावे को सिद्ध नहीं कर सकता।'' खैर, जो भी हो इतिहास की छिटपुट घटनाओं के आधार पर प्राचीन और मध्यकालीन भारतीय समाज को कतई खुला समाज नहीं माना जा सकता है। यदि कम–से–कम तथाकथित पिछड़ी एवं दलित जाति में अबतक कोई व्यक्ति नहीं रह पाता। सभी के सभी

समाज के सबसे ऊपरी स्तर पर पहुँच गये होते।

जाति व्यवस्था का स्वरूप ऐसा है कि उसमें गतिशीलता की कोई सम्भावना ही नहीं बनती है। जाति व्यवस्था में गतिशीलता देखना जाती व्यवस्था के अस्तित्व को नकारने जैसा है। आज भी भारत में जो जाति व्यवस्था में गतिशीलता दिखाई पड़ती है वह गतिशीलता जाति व्यवस्था में नहीं है, बल्कि मुख्य रूप से वर्ग व्यवस्था में है। आधुनिक भारत में जाति व्यवस्था के ऊपर वर्ग व्यवस्था अध्यारोपित हो गया है और परिवर्तन मुख्यतः उसी अध्यारोपित व्यवस्था में हो रहा है जिसे भारत के अधिकांश मानवशास्त्री तथा समाजशास्त्री गतिशीलता के रूप में विश्लेषित करते हैं।

उन्नसवीं सदी के उत्तरार्द्ध में अंग्रेजी शासनकाल के प्रभाव से भारतीय सामाजिक स्तरण में धीरे–धीरे परिवर्तन आने लगा। अंग्रेज अपने साथ अपनी संस्कृति ही नहीं लेकर आए, बल्कि उन्होंने नयी शिक्षा नीति, नयी प्रशासनिक व्यवस्था एवं नयी कानूनी व्यवस्था को भारत में लागू किया। उनके सारे नियम–कानून और जीवन के मूल्य काफी हद तक सामाजिक समानता के मूल्य पर आधारित थे। अतएव भारतीय समाज में पश्चिमीकरण के कारण एक क्रांतिकारी एवं युगान्तकारी परिवर्तन आया। इसके बावजूद कि उन्होंने भारत का काफी आर्थिक शोषण किया, उन लोगों ने समाजिक जीवन में चाहे–अनचाहे काफी लाभकरी परिवर्तन किया। विषमता पर आधारित समाज समता की राह पर चलने लगा। वे व्यक्ति का मूल्यांकन उसके जन्म से नहीं करके उसकी योग्यता से करते थे। फलस्वरूप समाज क्रमशः बन्धन मुक्त होता गया। जातिमूलक समाज वर्ग व्यवस्था से प्रभावित होकर खुलेपन की साँस लेने लगा। शिक्षा एवं

अध्यवसाय के आधार पर लोग समाज में एक–दूसरे से प्रतियोगिता करने लगे। हर एक व्यक्ति अपनी नयी पहचान बनाने के लिए प्रयासरत हो गया।

आजादी के बाद 1950 का काल एक विशेष समाजशास्त्री महत्व का काल है। गणतंत्र की स्थापना के साथ नये संविधान पर आधारित समता मूलक समाज की ओर भारत आगे बढ़ने लगा। भारत के इतिहास में यह काल विशेष महत्व का इसीलिए है कि संविधान के अंतर्गत हरेक व्यक्ति को बढ़ने का समान अवसर दिया गया। संविधान में मौलिक अधिकारों की बात की गई, ताकि भारत का प्रत्येक नागरिक अपनी योग्यता, गुण एवं परिश्रम के आधार पर समाज में आगे बढ़ सके। यह परम्परागत भारतीय सामाजिक मूल्य एवं प्रतिमान के प्रतिकूल है।

वर्तमान भारत में उद्योगीकरण, नगरीकरण, आधुनिकीकरण एवं नयी वैधानिक व्यवस्था ने संयुक्त रूप से जाति व्यवस्था पर गहरा आघात किया है। बड़े उद्योगों एवं दफ्तरों में सभी जाति के लोग मिलकर कार्य कर रहे हैं। विद्यालयों एवं महाविद्यालयों में सभी जाति के लोग बैठकर विद्या–अध्ययन कर रहे हैं। बड़े शहरों के अंतर्गत अक्सर अन्तर्जातीय विवाह, जिसे यहाँ प्रेम–विवाह भी कहा जाता है, की घटनाएँ घटती रहती है।

गाँव की तुलना में शहरों के अंतर्गत सामाजिक गतिशीलता की प्रक्रीया कुछ ज्यादा ही तेज है। सेवा एवं व्यवसाय के वहाँ नये–नये अवसर प्राप्त होते हैं। उच्च शिक्षा की सुविधाएँ वहाँ बेहतर हैं तथा गाँव की तुलना में शहरों में धार्मिक अंधविश्वास की कमी है। चूँकि जाति धर्म पर आधारित है और नगरों में धार्मिक विश्वास में कमी आयी है, इसीलिए जाति व्यवस्था के नियम–कानूनों में भी कुछ विशेष ढील पड़ी है। जाति की जगह

स्तरण का महत्वपूर्ण आधार वर्ग बनता जा रहा है। शहरों में लोग अब जाति की उच्चता पर उतना विचार न कर व्यक्ति के पद या व्यवसाय के आधार पर समाज में उनकी स्थिति के बारे में विचार करते हैं। यह सही है कि शहरों में जातिवाद कुछ ज्यादा ही फैला है, इसके बावजूद वर्ग व्यवस्था शहरों के अंतर्गत काफी जड़ जमा चुकी है। जीवन के मूल्यों में धन–सम्पत्ति, पद एवं सत्ता में हिस्सेदारी का महत्व पहले की तुलना में काफी अधिक हो गया है। आगे बढ़ने की प्रतियोगिता के कारण समाज में काफी अस्थिरता पैदा हो गयी है। अमरीकी मानवशास्त्री जेम्स सिल्वबर्ग ने भी अपने अध्ययनों में यह तथ्य स्वीकार किया है कि भारतीय समाज में पहले की तुलना में बहुत ज्यादा खुलापन आ गया है। सामाजिक गतिशीलता के सम्बन्ध में जो तथ्य मौजूद हैं उन तथ्यों के आधार पर भारत को अब एक बन्द समाज की श्रेणी में नहीं रखा जा सकता है। यह भी सही है कि पाश्चात्य देशों की तुलना में यहाँ गतिशीलता कम है, पर आज जितनी गतिशीलता भारतीय समाज में मौजूद है, उसकी तुलना इस देश के किसी भी ऐतिहासिक काल से नहीं की जा सकती है।

****

विशिष्ट सन्दर्भ ग्रन्थः

1. सिंह, जे.पी. – बदलते भारत की समस्याएँ।
2. सिंह, जे.पी. – सामाजिक परिवर्तन।
3. बाटोमर टी.बी. – सोशियोलॉजी।
4. धुर्ये जी.एस. – कास्ट क्लास एण्ड अकुपेशन।
5. बेतई, आन्द्रे – सोसाइटी एण्ड पोलिटिक्स इन इंडिया।
6. दुबे, एस.सी. – मॉर्डनाइजेशन एण्ड डेभलॉपमेन्ट।
7. सिंह, योगेन्द्र – मॉर्डनाइजेशन ऑफ इंडियन ट्रेडीशन।

***